کیا جنت میں جانے کے لیے بھی......

میرا سوال بہت سادہ تھا۔ ''کیا جنت میں جانے کے لیے بھی حالات خراب ہیں؟''

یہ سوال میں نے اپنے مخاطب کی جس طویل گفتگو کے بعد کیا تھا اس میں ملکی اور بین الاقوامی حالات کی خرابی، سیاسی اور مذہبی لوگوں کی برائی، ملک کے معاشی اور سیاسی مسائل، غیر مسلموں کی سازشیں، مسلمانوں کی زبوں حالی اور ان جیسی تمام منفی چیزوں کا بیان شامل تھا جو بہادر سے بہادر انسان کا حوصلہ پست کر دینے کے لیے بھی کافی تھا۔

میں نے حالات کا مثبت رخ دکھانے کی جتنی کوشش کی، ان صاحب کی باتوں میں اتنی ہی تلخی اور مایوسی اجاگر ہوتی چلی گئی۔ جب مجھے پوری طرح اندازہ ہو گیا کہ میں ایک اندھے کو روشنی دکھا رہا ہوں تو میں نے وہ سوال اٹھایا جو شروع میں بیان ہوا ہے۔

وہ کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر بولے۔ ''آج کل فحاشی بہت عام ہے، ہر جگہ سود پھیلا ہوا ہے، علمائے سو کا دور دورہ ہے......''، مجھے معلوم تھا کہ ان کی تقریر لمبی ہوگی، اس لیے میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔ ''یقین کیجیے یہ چیزیں جتنی زیادہ عام ہوں گی جنت میں جانا اتنا ہی آسان ہوگا کیونکہ حالات کی رعایت سے اللہ تعالیٰ کا احتساب ہلکا ہوگا۔ آج جو آدمی جنت میں جانے کا عزم کر لے اور اس کے لیے اخلاص کوشش شروع کر دے، وہ انشاء اللہ جنت میں جانے میں ضرور کامیاب ہوگا۔''

میں نے ان کی دلیل انھی پر الٹ دی تھی۔ میں نے مان لیا تھا کہ حالات اتنے ہی خراب ہیں جتنے وہ بیان کر رہے ہیں، مگر جنت میں جانا انھی خراب حالات میں زیادہ آسان ہے۔ اس لیے انھیں چپ ہونا پڑا۔ میں نے رخصت کے لیے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''حالات خراب ہیں تو ان کا رونا رونے کے بجائے لوگوں کو یہ بتائیے کہ جنت میں جانا آسان ہوتا ہے۔ خدارا لوگوں کو کوئی تو مثبت بات بتائیں۔ شاید یہی سامان بخشش بن جائے۔''

خدا زندہ ہے

کوئی بندہ مومن اگر حقیقی معنوں میں زندہ ہو اور اپنے رب سے ایک زندہ تعلق قائم رکھتا ہو تو پروردگار عالم کی معرفت کے ایسے تجربے اس پر گزرتے ہیں کہ وہ ہر لمحہ اپنی زندگی میں اپنے مالک کی کرم فرمائی اور اس کی قربت کا زندہ تجربہ کرسکتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل میرے ایک دوست نے میرے ساتھ اپنا ایک ایسا ہی تجربہ شیئر کیا۔

ایک روز انہیں اپنا کوئی ضروری دفتری کام رات گئے تک گھر میں نمٹانا تھا تاکہ اگلی صبح اسے کسی میٹنگ میں پیش کیا جاسکے۔ اس کام کے لیے انٹرنیٹ، کمپیوٹر کے کچھ سوفٹ وئیر کے علاوہ بعض دیگر لوگوں کی مدد درکار تھی۔ کام بہت مشکل تھا اور بہت رات ہوگئی تھی، مگر انہوں نے ہمت ہارے بغیر مسئلہ حل کرنے کی کوشش شروع کردی۔ ایک ایک کرکے وہ ہر رکاوٹ دور کرتے چلے گئے۔ مگر ایک آخری مسئلہ ایسا اٹکا کہ کئی گھنٹے کی کوشش کے بعد بھی حل نہ ہوسکا اور وہ ہمت ہار گئے۔

دو تہائی رات ہو چکی تھی۔ مگر وہ کچھ نوافل پڑھ کر سونے کے عادی تھے۔ تھکن کی وجہ سے وہ قدرے بے دلی کے ساتھ نفل پڑھنے لگے۔ جیسے ہی سجدے میں گئے تو ان کی کمر میں شدید چمک اٹھی۔ یہ بغیر ٹیک لگائے مسلسل بیٹھ کر کام کرنے کا نتیجہ تھا۔ اس لمحے انہیں احساس ہوا کہ وہ عاجز انسان ہیں جو اپنی قدرت سے کمر جھکا کر ایک سجدہ کرنے کے قابل بھی نہیں۔ یہ احساس انہیں تڑپا گیا۔ انہوں نے بہت شدت سے پروردگار سے دعا کی کہ اے قادر مطلق! میں کچھ نہیں کرسکتا، مگر تو سب کچھ کرسکتا ہے۔ میرا مسئلہ حل کردے۔ انہوں نے نماز ختم کی۔ ذہن میں مسئلے کا حل اچانک کوندا اور تھوڑی دیر میں وہ مسئلہ حل ہوگیا جو گھنٹوں سے حل نہ ہو رہا تھا۔

خدا زندہ ہے۔ ہاں اس کو محسوس کرنے کے لیے بندے میں خود زندگی ہونی چاہیے۔ جس شخص میں ایمان کی زندگی موجود ہے وہ زندگی کے ہر موڑ پر خدا کی معیت کا زندہ تجربہ کرسکتا ہے۔

گاڑی سے پردہ

پچھلے دنوں میں نے ایک مضمون ''مردوں کی نگاہیں'' کے عنوان سے لکھا۔ اس مضمون میں مردوں کے نگاہ نیچی رکھنے کے حکم کی اہمیت بتائی گئی تھی۔ یہ مضمون ایک صاحب نے پڑھا اور اس سے مکمل اتفاق کیا۔ پھر انھوں نے ایک بڑی دلچسپ بات اپنے حوالے سے یہ بتائی کہ وہ زندگی میں ایک عرصے تک چمکتی دمکتی نئے ماڈل کی گاڑیوں سے نگاہوں کا ایسا ہی پردہ کرتے رہے ہیں۔

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب بینکوں سے قسطوں پر ملنے والے قرضوں کی وجہ سے سڑکوں پر ہر جگہ نت نئے ماڈل کی گاڑیاں نظر آتی تھیں۔ انہیں اپنی فیملی کے لیے گاڑی کی ضرورت تھی، مگر اتنے وسائل نہیں تھے کہ وہ نئے ماڈل کی گاڑی خرید سکیں۔ مگر جب کبھی وہ سڑکوں پر ہر طرف چلتی نئے ماڈل کی گاڑیوں کو دیکھتے تو دل میں انہی کی خواہش پیدا ہوتی۔ اس مسئلے کا ایک حل انھوں نے یہ نکالا کہ محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً نئی گاڑیوں سے نگاہوں کا پردہ شروع کر دیا۔ جہاں کہیں کوئی نئی گاڑی نظر آتی وہ بالجبر اپنی نگاہیں ان کی طرف سے پھیر دیتے۔ پہلے وہ ان گاڑیوں کو غور سے دیکھتے تھے تو دل میں خواہش بڑھتی تھی، مگر اس عمل سے یہ خواہش کم ہوگئی۔

حقیقت یہ ہے کہ بندہ مومن آخرت کے لیے جیتا ہے۔ اگر وہ اپنی ساری تگ و دو کا مقصد دنیا اور اس کی رنگینیوں کو بنالے تو وہ آخرت کی فلاح کے لیے سرمایہ کاری نہیں کر سکے گا۔ اس راہ میں اکثر لوگ گناہ اور حرام کا راستہ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ یہ نہ بھی کریں تب بھی خواہشیں اتنی ہوتی ہیں کہ ہر خواہش پوری کرنے کے بعد ایک نئی خواہش سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ نتیجتاً وہ ساری زندگی خواہشات کے پیچھے بھاگتا رہے گا۔ اس کا تمام پیسہ اور وقت دنیا کی چیزوں کی خواہش اور پھر ان کے حصول کی جدوجہد میں گزر جائے گا۔ ایسے میں خواہشات کا راستہ روکنے کا یہی طریقہ ہے کہ بندہ مومن نگاہوں کا پردہ شروع کر دے۔ چاہے وہ گاڑی سے ہو یا بنگلے سے۔ یہی رویہ جنت کی ختم نہ ہونے والی نعمتیں حاصل کرنے کا درست طریقہ ہے۔

تحقیق، سائنس اور ہم

دور جدید سائنسی ترقی کا دور ہے۔ یہ دور سائنسی طرز فکر (Scientific Thinking) اور سائنسی طرز تحقیق (Scientific Research Method) سے عبارت ہے۔ یہ سائنسی طرز تحقیق اس طرح غالب آ چکا ہے کہ فزیکل سائنس ہی نہیں بلکہ سوشل سائنسز میں بھی اس طریقے کو چھوڑ کر پیش کی جانے والی کوئی بھی بات مستند تسلیم نہیں کی جاتی۔

اس طریقہ کار کے چھ اہم مراحل ہیں۔ پہلا مشاہدہ جس میں انسان کے علم میں کوئی بات آتی ہے۔ چاہے مشاہدے سے ہو یا کسی اور طریقے سے۔ اس کے بعد ایک مفروضہ قائم کیا جاتا ہے۔ یہ دوسرا مرحلہ ہے۔ تیسرے مرحلے پر اس حوالے سے تمام تر معلومات جمع کی جاتی ہے۔ چوتھے مرحلے پر اس معلومات کا تجزیہ و تحلیل کیا جاتا ہے۔ پانچویں مرحلے پر ایک رائے اخذ کی جاتی ہے اور چھٹے اور آخری مرحلے پر نتائج فکر بیان کیے جاتے ہیں۔

یہ طریقہ کار بظاہر سائنسی طریقہ کار کہلاتا ہے مگر درحقیقت یہ تحقیق کا فطری طریقہ کار ہے۔ ہر وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے عقل و شعور سے نوازا ہے وہ حقائق تک پہنچنے کے لیے یہی راستہ اختیار کرے گا۔ جو اس راستے کو چھوڑے گا وہ جھوٹ سنے گا اور اسی کو پھیلائے گا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بے مثال حکیمانہ اسلوب میں اس بات کو یوں بیان کیا ہے۔

کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بیان کرنے لگے۔

یہ روایت امام مسلم اپنے صحیح کے مقدمے میں لائے ہیں اور دیگر محدثین مثلاً امام البانی نے اس کو صحیح کہا ہے۔ (صحیح الجامع، حدیث رقم 4482)۔ اسی مفہوم کی ایک صحیح روایت یہ ہے کہ کسی شخص کے گنہ گار ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بیان کرنے لگے۔ (السلسلة الصحيحة :2025)۔

ان دونوں روایات میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے اسے اگر مذکورہ بالا سائنٹفک ریسرچ میتھڈ کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تحقیق کے چھ مراحل میں سے جو شخص بیچ کے دو مرحلے چھوڑ دے وہ جھوٹا ہے۔ یعنی سنی سنائی بات سے ایک مفروضہ قائم کرنا، اسی سنی سنائی پر اپنی رائے بنانا اور اطمینان کے ساتھ اسے بیان کرنے لگ جانا انسان کو جھوٹا اور گنہگار بنا دیتا ہے۔ اس لیے انسان اس حدیث کے مطابق زندگی گزارنا چاہے تو اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ رائے قائم کرنے سے قبل متعلقہ موضوع پر پوری معلومات اکٹھی کرے اور پھر ہر ہر پہلو سے اس معلومات کا تجزیہ کرے۔ تب ہی کوئی رائے قائم کر کے اسے بیان کیا جا سکتا ہے۔

کوئی انسان اگر یہ نہیں کر سکتا تو قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کے پاس صرف دو راستے ہیں۔ ایک وہ جسے متعدد صحیح روایات میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے، (بخاری، رقم 1660)۔ اس روایت کی روشنی میں تو صاف نظر آئے گا کہ بلا تحقیق صرف سنی سنائی بات آگے بڑھانا چونکہ جھوٹ اور گناہ کا کام ہے اس لیے اسے کرنے سے بہتر ہے کہ آدمی خاموش رہے۔

دوسرا راستہ وہ ہے جو قرآن کریم میں واقعہ افک کے حوالے سے سورہ نور میں اس طرح بیان ہوا ہے کہ اہل ایمان کے سامنے کسی کے متعلق کوئی منفی بات سامنے آئے اور انسان کسی قسم کی تحقیق کر کے بات کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو تو اسے حسن ظن سے کام لینا چاہیے اور اچھی بات ہی بیان کرنی چاہیے۔

یہ ہے قرآن و حدیث اور اب دیکھیے کہ آج ہم مسلمان کس جگہ پر کھڑے ہیں۔ ہماری پوری معاشرت، سیاست بلکہ دینداری میں بھی جو اصول اس وقت کارفرما ہے وہ یہ کہ جہاں اور جب کبھی کسی کے متعلق کوئی منفی بات سامنے آئے بلا تحقیق اسے آگے بڑھانا شروع کر دیا جائے۔

چاہے کسی کی کردارکشی ہورہی ہو، کسی کی عزت پر حرف آرہا ہو، کسی کے ایمان پر حملہ ہورہا ہو، ان سب سے بے نیاز ہوکر ہم بڑے مزے سے اس بات کو آگے پھیلانے لگتے ہیں۔ ہم تحقیق کرتے ہیں، نہ متعلقہ معلومات جمع کرتے ہیں، نہ حقائق کا جائزہ لیتے ہیں، یہ ناممکن ہو تو خاموش رہتے اور نہ حسن ظن سے کام لیتے ہیں۔ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر ہمارا رویہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ ہم لوگوں کے متعلق منفی چیزوں کی جستجو کرتے ہیں۔ چن چن کر لوگوں سے متعلق منفی معلومات اکٹھی کرتے ہیں اور اسی کو آگے بڑھاتے ہیں۔

انٹرنیٹ کی ایجاد کے بعد ہمارا یہ منفی رویہ اور نمایاں ہوکر سامنے آنے لگا ہے۔ انٹرنیٹ پر یہ چلن عام ہے کہ مختلف فورم اور سائٹس والے مقبولیت حاصل کرنے کے لیے کسی بھی مشہور شخص کے خلاف کوئی منفی بات ڈال دیتے ہیں۔ جس کے بعد ہزاروں لاکھوں لوگ اس منفی بات کو سننے، دیکھنے اور پڑھنے کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ پھر فیس بک اور دوسرے ذرائع سے ایسی چیزوں کو خوب پھیلاتے ہیں۔

تاہم یہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے کہ ایسے لوگ جھوٹے ہیں اور گنہگار ہیں۔ قیامت کے دن ایسے لوگ جھوٹے اور گناہگار ہی اٹھائے جائیں گے۔

منفی سوچ وہ زہر ہے جس کا ایک قطرہ بھی
دماغ کی ہر مثبت سوچ کو آلودہ کردیتا ہے

تخلیقی صلاحیت

علامہ اقبال مسلمانوں کی علمی روایت کے وہ آخری بڑے آدمی ہیں جن کی شخصیت پر ایک عمومی نوعیت کا اتفاق پایا جاتا ہے۔ان کی فکری رہنمائی بجا طور پر انہیں دور جدید میں امت مسلمہ کا سب سے موثر فکری لیڈر بناتی ہے۔خاص کر جنوبی ایشیا میں تو ان کی یہ حیثیت اتنی مسلمہ ہے کہ اس خطے کا شاید ہی کوئی مفکر اور مصنف ہوگا جو بلا واسطہ یا بالواسطہ ان سے متاثر نہ ہو۔

اقبال کو جس چیز نے عظمت کے اس مقام پر فائز کیا ہے وہ ان کی تخلیقی صلاحیت ہے۔ شعر بہت لوگ کہتے ہیں۔اسی طرح لیڈر اور مفکر بھی بہت ہوتے ہیں۔ ماقبل تقسیم کا مسلم انڈیا شعرا اور لیڈروں دونوں کے معاملے میں خود کفیل تھا۔مگر اقبال کی تخلیقی صلاحیت کی عظمت یہ تھی کہ انھوں نے جو بات کہی وہ اس وقت کہی جب دوسروں کے ہاں اس کا تصور بھی نہیں تھا۔ان کا وژن ہمیشہ دوسروں سے بہت آگے دیکھنے اور ان کی منفرد قوت بیان اسے بیان کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتی تھی۔ وہ جدید و قدیم اور مشرق و مغرب کے سارے علوم سے واقف تھے۔ قانون، سیاست، مذہب اور فلسفے سب پر انہیں گہری دسترس حاصل تھی۔ پاکستان کا وجود ان کے علم و بصیرت کا ایک زندہ نمونہ ہے۔ایک مغلوب اور مایوس قوم کو معجزانہ شاعری سے زندہ کرنا، دور جدید کے تصور قومیت کے مطابق اسے ایک قوم بنانے کے لیے ملی اساس فراہم کرنا، خطبہ الہ آباد میں اس ملت کا سیاسی نصب العین واضح کرنا، حاکم انگریزوں کے سامنے اس قوم کا مقدمہ پیش کرنے کے لے ایک بہترین لیڈر قائداعظم کا انتخاب کرنا،صدیوں سے تقلید و جمود میں جکڑی اس قوم کی مذہبی فکر کی تشکیل جدید کے لیے خطبات دینا؛ یہ وہ کارنامے ہیں جن پر جب بھی غور کیا جاتا ہے تو سمجھ نہیں آتا کہ ایک آدمی اس درجہ کی تخلیقی صلاحیت کا مظاہرہ کیسے کرسکتا ہے۔

تاہم پاکستان کی شکل میں دنیا کے نقشے پر سب بڑی مسلم اور دنیا کی پانچویں بڑی ریاست کا ظاہر ہوجانا یہ بتاتا ہے کہ اقبال کتنے بڑے آدمی تھے۔آج بہت سے لوگ پاکستانیوں کی موجودہ حالت دیکھ کر اقبال پر تنقید کرتے ہیں۔مگر سچ یہ ہے کہ پاکستان کی موجودہ حالت کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم نے اقبال کے سیاسی اور ملی وژن کو تو قبول کیا لیکن ان کے فکری وژن کو کم وبیش رد کر دیا یا کم از کم اس سے واقف نہیں ہیں۔اس ناواقفیت کی ایک وجہ شاید یہ تھی کہ اقبال نے اپنی فکر زیادہ تر فارسی شاعری میں پیش کی یا پھر ان خطبات میں جن کو سمجھنا اور جن سے استفادہ کرنا اکثر و بیشتر لوگوں کے بس کی بات نہیں۔

اقبال کا وہ فکری وژن جو ہم نے رد کر دیا اور جس کا رد کرنا ہماری تباہی کی وجہ بن چکا ہے، اسے اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو وہ تخلیقیت ہے۔یعنی تقلید اور جمود کی زنجیروں کو توڑ کر ایک نئی دنیا کی تعمیر۔ظاہر ہے کہ اس تعمیر کے لیے تخلیقی صلاحیت چاہیے۔یہ اگر ہے تو نئی دنیا تخلیق ہوسکتی ہے اور ہر طرح کے حالات میں راستہ نکل سکتا ہے۔یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبال نے 'جاوید نامہ' میں اللہ تعالیٰ کے کلام اور پیغام کی شکل میں اس طرح بیان کیا ہے۔

ہر کہ او را قوت تخلیق نیست

پیش ما جز کافر و زندیق نیست

از جمال ما نصیب خود نبرد

از نخیل زندگانی بر نخورد

یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ جو تخلیقی سوچ نہیں رکھتا ہمارے نزدیک کافر و زندیق ہے۔ اس نے ہمارے جمال سے اپنا حصہ نہیں پایا اور وہ زندگی کے درخت کا پھل کھانے سے محروم رہا۔ تخلیقی قوت قوموں سے جب کبھی ختم ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ ان میں تخلیقی صلاحیت

نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کوئی انسان ایسا پیدا نہیں کرتے جس میں کسی نہ کسی پہلو سے کوئی تخلیقی صلاحیت نہ ہو۔ ہوتا صرف یہ ہے کہ تقلید و جمود میں جکڑی ہوئی ایک قوم میں تخلیقی بات کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر طرف سے مخالفت کا طوفان اٹھ جائے گا جسے سہنے کے لیے بڑی جرات چاہیے ہوتی ہے۔اس کے لیے انسان کو اپنی بات پر بہت اعتماد ہونا ضروری ہوتا ہے۔ یہ جرات اور اعتماد علم سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ خود اقبال کو بہت سی مخالفتوں حتیٰ کہ کفر کے فتوؤں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔لیکن اقبال جدید و قدیم اور مغرب و مشرق کے علم کے عالم تھے اس لیے آخر کار جیت ان کی تخلیقی صلاحیت کی ہوئی۔ یہی وہ تخلیقی صلاحیت تھی جس نے پاکستان کے حصول کا معجزہ دکھایا اور یہی وہ تخلیقی صلاحیت ہے جو آج اگر پیدا ہو جائے تو گرداب میں پھنسے پاکستان کی کشتی ہر بھنور سے نکال سکتی ہے۔

ایمان کا اثر معاملات زندگی

عن انس رضی الله تعالیٰ عنه قال خطبنارسول الله صلی الله علیه وسلم الا قال لاایمان لمن لا امانة له ولادین لمن عهد له۔ (مشکوٰۃ)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بھی خطبہ دیا، اس میں یہ ضرور فرمایا کہ جس کے اندر امانت نہیں، اس کے اندر ایمان نہیں اور جسے عہد کا پاس نہیں، اس کے پاس دین نہیں ہے۔

ایمان کا اثر اخلاق پر

عن عمرو بن عبسة قال قلت یا رسول الله صلی الله علیه وسلم ماالایمان قال الصبر والسماحة۔ (مسلم)

حضرت عمرو بن عبسہؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ وعلیہ وسلم سے پوچھا: ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ایمان نام ہے صبر اور سماحت کا۔

پروفیسر محمد عقیل

فحش اشتہارات

موسم سرما کے رخصت ہونے کے ساتھ ہی شاہراہوں پر جگہ جگہ ایڈورٹزمنٹ کے سائن بورڈز نصب کیئے گئے ہیں۔ یہ خواتین کی لان فروخت کرنے والی کمپنیوں اور فیشن ڈیزائنرز کی طرف سے لگائے گئے ہیں۔جن کا مقصد تو خواتین کے کپڑوں کی فروخت ہے،مگران میں سے اکثر اشتہارات اخلاقی معیار سے گرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ایڈورٹائزنگ آج کل مارکیٹنگ کا ایک اہم اور لازمی جزو ہے جس کا بنیادی مقصد خریدار کو متوجہ کرنا،اسے پراڈکٹ کے بارے میں تفصیلات بتانا اور خریدنے پر مجبور کرنا ہے۔اگر مارکیٹنگ کے اس اصل مقصد کا تجزیہ کیا جائے تو بظاہر اس میں کوئی اخلاقی قباحت نظر نہیں آتی۔لیکن دولت کمانے کی ہوس،ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کاوش اور ہر جائز ناجائز طریقے سے اپنے حریف پر سبقت لے جانے کی کوشش نے ایڈورٹائزنگ کو ایک غیر اخلاقی عمل بنا دیا ہے۔

خواتین کی نیم عریاں نمائش کا یہ عمل صرف لان کی ہورڈنگز تک محدود نہیں۔ٹی وی پر چلنے والے اکثر اشتہارات اس برائی کو پھیلانے میں آگے بھی ہیں اور موثر بھی۔ان اشتہارات میں عورت کے وجود کا ایک ایک انگ نمایاں کرنے اور نسوانی سراپے کو کیش کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ فحش ڈائلاگز، بے ہنگم موسیقی، آبرو باختہ لطیفے،نوجوانوں کو رات بھر عشقیہ باتوں کی ترغیب اور دیگر پہلو بھی ان اشتہارات کا لازمی جزو ہیں۔

اگر صاف پانی کے تالاب میں گندگی ڈالی جائے تو پانی دھیرے دھیرے گدلا ہونے لگتا ہے اور اس کا دیکھنے والوں کو احساس بھی نہیں ہوتا۔اسی طرح ہمارے اشتہارات میں یہ غیر اخلاقی پہلو اس آہستگی کے ساتھ سرایت کر گیا ہے کہ اب یہ سب کچھ شرفاء کو بھی برا نہیں لگتا۔

اس کے نتیجے میں پورا معاشرہ نیم عریانی، فحش کلامی، گھٹیا مذاق اور بے ہنگم موسیقی کے ساتھ سمجھوتہ کرتا نظر آ رہا ہے۔

اگر اس قبیح عمل کو یہاں نہ روکا گیا تو یہ معاملہ یہاں رکے گا نہیں۔ حرص و ہوس کے پجاری ان معاملات کو اسی نہج پر لے آئیں گے کہ پھر واپسی مشکل سے مشکل تر ہوتی چلی جائے گی۔ شکوہ ان لوگوں سے نہیں جو مغربی ذہنیت کے غلام ہیں۔ شکایت تو قوم کے ان سنجیدہ حلقوں سے ہے جو حیا کو ایک بنیادی قدر مانتے اور اسے فروغ دینے کے حامی ہیں۔ لیکن نہ تو ان کی زبانیں کسی فورم پر آواز اٹھاتی نظر آتی ہیں اور نہ ہی ان کے قلم اس بے اخلاقی پر حرکت میں آتے ہیں۔

صورت حال اگر یہی رہی تو اگلی نسلوں کے آنے تک حیا ایک ماضی کی داستان بن کے رہ جائے گی اور مغربی و اسلامی اقدار کا فرق برائے نام رہ جائے گا۔ اس موقع پر صنعت کاروں، تاجروں اور حکومتی اداروں کو مل بیٹھ کر اس مسئلے کا حل تلاش کرنا ضروری ہے تا کہ اس طرح کا ایک کوڈ آف کنڈکٹ بنایا جائے جو مارکیٹنگ کے مقاصد بھی حاصل کرتا ہو اور فحاشی کے زمرے میں بھی نہ آئے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو نتیجے کے طور پر جنسی ناآسودگی، آبروریزی اور آزادانہ جنسی اختلاط کا ایک طوفان جنم لے گا جو محض چند طبقات تک محدود نہیں رہے گا بلکہ اس کا شکار ہر دوسرا محلّہ اور گھر ہو گا اور کیا خبر یہ اسی اشتہار دینے والے کا گھر ہو جس نے عریانی کے ذریعے دولت کمانے کی کوشش کی تھی۔

پروفیسر محمد عقیل

مشکلات میں جینے کا فن (2)

اصول نمبر 2۔ بدترین صورت حال کا مقابلہ کریں

کیس اسٹڈی:

"ولیم نیویارک میں پٹرول بیچنے کا کاروبار کرتا تھا۔ اس کا کاروبار اپنے عروج پر تھا کہ وہ ایک بدترین سانحے سے دوچار ہوگیا۔ اس وقت نیویارک میں جنگ کے قوانین نافذ تھے اور قانون کے تحت ولیم کی کمپنی محض انہی گاہکوں کو تیل فراہم کرنے پر پابند تھی جن کے پاس راشن کارڈ تھے۔ لیکن ولیم بے خبر تھا کہ اس کی کمپنی کے ٹرک ڈرائیور گاہکوں کو کم مقدار میں تیل سپلائی کرکے کچھ تیل بچا لیتے اور پھر یہ فاضل تیل وہ مہنگے داموں دیگر لوگوں کو فروخت کرتے تھے۔ یہ سب کچھ ولیم کی ناک کے نیچے ہورہا تھا لیکن وہ بے خبر تھا۔

ایک دن ایک شخص اس سے ملنے آیا۔ اس نے خود کو حکومت کا انسپکٹر ظاہر کیا۔ اس نے تفصیل سے ولیم کو ڈرائیوروں کی اس حرکت کے بارے میں بتایا۔ ساتھ ہی اس نے ولیم سے ایک بھاری رقم کی صورت میں رشوت کا مطالبہ بھی کردیا۔ ولیم کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ دن بھی دیکھنا نصیب ہوگا۔ گو کہ ولیم اس میں ملوث نہیں تھا لیکن قانونی طور پر وہی ان سب معاملات کا ذمہ دار تھا۔

وہ اتنا فکرمند ہوا کہ بستر دراز ہوگیا۔ تین راتیں اور دن اس کیفیت میں گذرے کہ نہ تو وہ سو سکا اور نہ ہی کچھ کھا سکا۔ کبھی وہ سوچتا کہ رشوت دے کر جان چھڑا لے لیکن اس بات کی کیا گارنٹی تھی کہ وہ آدمی اس کا پیچھا چھوڑ دیگا۔ کبھی وہ سوچتا کہ اس آدمی سے جا کر کہہ دے کہ جو جی میں آئے کرلو لیکن اس صورت میں اس کا چوبیس سالہ بزنس برباد ہوجاتا۔

دن یونہی گذر رہے تھے کہ ایک شب اس کے ہاتھ میں ولز ایچ کیریئر کا ایک کتابچہ ملا جس

میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ "بری ترین صورت حال کا مقابلہ کریں"۔اس نے اس کتابچے کے بتائے گئے طریقہ کار پر عمل کا فیصلہ کیا۔

اقدام نمبر ایک کے طور پر اس نے یہ جائزہ لیا کہ اس معاملے میں ناکامی کا زیادہ سے زیادہ کیا نقصان ہوسکتا ہے۔اس کا جواب یہ ملا کہ کاروبار ٹھپ ہو جائے گا اور اسے جیل بھی بھیجا جاسکتا ہے۔اس سے زیادہ کچھ ممکن نہ تھا۔نہ تو اسے پھانسی پر لٹکایا جاسکتا اور نہ ہی کالے پانی کی سزادی جاسکتی تھی۔

اقدام نمبر دو میں اس نے خود کو اس بری صورت حال کے لئے تیار کرنا شروع کر دیا۔اگر اس کا کاروبار ٹھپ ہو گیا اور جیل ہوگئی تو رہائی کے بعد وہ ملازمت کے لئے تگ و دو کرسکتا ہے کیونکہ اس کے پاس اس فیلڈ کا ایک وسیع تجربہ تھا۔یہ سوچ کر اس کے بوجھ میں کمی واقع ہونی شروع ہوئی اور وہ مثبت بات سوچنے کے قابل ہوتا گیا۔

تیسرے اور آخری اقدام کے طور پر اس نے سوچنا شروع کیا کہ وہ اس بدترین صورت حال کے منفی اثرات کو کس طرح کم کرسکتا ہے۔اس کا ذہن اب کافی حد تک نارمل ہو چکا تھا اس لئے اس کے ذہن میں کئی حل آنے لگے۔اس نے طے کیا کہ وہ اپنے وکیل کو یہ ساری باتیں بتائے گا اور اس سے مشورہ لے گا۔حالانکہ یہ سامنے کی بات تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

یہ تینوں اقدام طے کر لینے کے بعد وہ بستر پر دراز ہوگیا اور اتنی گہری نیند سویا گویا کہ وہ نشے میں چور ہو۔اگلی صبح وہ اٹھا اور وکیل کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔وکیل نے اطمینان سے یہ سب کچھ سنا اور مشورہ دیا کہ ولیم اس صورت حال کو ڈسٹرکٹ اٹارنی کے علم میں لے آئے۔ولیم نے ایسا ہی کیا۔ڈسٹرکٹ اٹارنی نے ولیم کی باتیں سنیں اور اسے بتایا کہ جو شخص ولیم کو دھمکی دے رہا ہے وہ کوئی انسپکٹر نہیں بلکہ ایک بلیک میلر ہے اور وہ کافی عرصے

سے پولیس کو مطلوب ہے۔ چنانچہ ولیم کی مدد سے اس جعلی انسپکٹر کو پکڑ لیا گیا اور یوں ولیم کی خلاصی ہوئی۔ ولیم نے سوچا کہ اگر وہ اس بدترین صورت حال سے نبٹنے کیلئے تین اقدامات نہ اٹھاتا تو آج وہ اسی بلیک میلر کے ہاتھوں ٹھگا جا رہا ہوتا یا پھر کسی نفسیاتی ہسپتال میں زیرِ علاج ہوتا۔ (ڈیل کارنیگی کی کتاب سے ماخوذ)

وضاحت:

ہم اگر اپنی زندگی کا جائزہ لیں تو ہم میں سے ہر شخص کی زندگی میں ایسے سانحے اور حادثے رونما ہو جاتے ہیں جو ہمیں ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ ایسے میں دو ہی راستے ہوتے ہیں۔ یا تو ہم صورت حال کے آگے گھٹنے ٹیک کر خود کو تقدیر کے دھارے میں بہنے دیں۔ دوسرا حل یہ ہے کہ اس سانحے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑے ہو جائیں اور اس سے مقابلہ کریں۔ پہلی صورت میں بے چینی اضطراب، ڈپریشن، مایوسی اور بیماری ہمارے حصے میں آئے گی۔ دوسری صورت میں ہم خود اعتمادی، سکون اور صحت مند زندگی کی جانب پیش قدمی کریں گے۔ ایک فلسفی لن یونگ نے کہا تھا " حقیقی ذہنی سکون اسی صورت میں میسر آ سکتا ہے جبکہ آپ بری ترین صورت حال کو ذہنی طور پر تسلیم کر لیں"۔

یہ بدترین صورت حال کیا ہو سکتی ہے؟ اس سے مراد کسی عزیز کا انتقال، کسی معذوری کا سامنا، کاروبار میں تباہی، تعلیمی میدان میں ناکامی، کسی انسلٹ کا سامنا، کسی مقصد کے حصول میں ناکامی وغیرہ ہو سکتی ہے۔ جب بھی کسی ناگہانی آفت کا سامنا کرنا پڑے تو ولز ایچ کیریئر کا فارمولا استعمال کرتے ہوئے خود سے درج ذیل سوالات کریں:

۔ میرے اس مسئلے سے بدترین صورت حال کیا ہو سکتی ہے؟

۔ اس بدترین صورت کے اثرات سے میں کس طرح نبٹ سکتا ہوں؟

۔اس بدترین صورت حال کے منفی اثرات کو کم کرنے کے لئے میں کیا اقدام کر سکتا ہوں؟

اسائنمنٹ:

۔اس طرح کا کوئی کیس آپ اپنی یا دوستوں کی زندگی سے لے کر تحریر کریں اور ان تین اقدام کو اپلائی کرتے ہوئے تحریر کریں کہ اس سے کس طرح نبٹیں گے۔

۔آپ جب کسی بری صورت حال کا سامنا کرتے ہیں تو اس سے کس طرح نبٹتے ہیں۔تحریر کریں۔

۔آپ گاڑی چلا رہے ہیں کہ اچانک سامنے ایک بچہ آ جاتا ہے۔آپ اس کو ہٹ کر دیتے ہیں جس سے وہ شدید زخمی ہو جاتا ہے۔آپ کیا کریں گے؟ان تین اقدامات کی روشنی میں حل تجویز کریں۔

اخلاصِ نیت

نیت کے مطابق اجر

عن عمر بن الخطاب رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم انما الاعمال بالنیات وانما لامری مانوی، فمن کانت هجرته الی الله ورسوله فهجرته الی الله وسوله۔ ومن کانت هجرته الی دنیایصیبها اوامراة یتزوجها فهجرته الی ماهاجر الیه۔(متفق علیہ)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعمال کا دارومدار صرف نیت پر ہے اور آدمی کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہوگی۔(مثلاً) جس نے اللہ اور رسولؐ کے لیے ہجرت کی ہوگی، واقعی اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف ہوگی اور جس کی ہجرت دنیا حاصل کرنے یا کسی عورت سے شادی کرنے کے لیے ہوگی تو اس کی ہجرت دنیا کے لیے یا عورت کے لیے ہی شمار ہوگی۔

مکاتیب

ابو یحییٰ

اللہ تعالیٰ پر کچھ اعتراضات کے جواب

محترم محمد صاحب

السلام وعلیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

آپ کے طویل سوال کا خلاصہ اگر کیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا شرک کی سخت مذمت کرنا، اس سے بچنے کے مطالبے پر اصرار کرنا، اس پر سزا مقرر کرنا دو وجوہات سے درست نہیں لگتا۔ ایک یہ کہ یہ احسان کر کے بدلہ چاہنے کا عمل ہے جو کہ اعلیٰ اخلاقیات کے خلاف ہے۔ دوسرا یہ کہ اپنے شرکا کے مقابلے میں اپنی ذات کے بارے میں حساس ہونا کمزوری کی علامت ہے۔ اس لیے میں آپ کے سوال کو گستاخی نہیں بلکہ آپ کی اللہ تعالیٰ سے وہ محبت ہی خیال کرتا ہوں جس میں ہم اپنے رب کو ہر لحاظ سے مکمل اور بے عیب دیکھنا چاہتے ہیں۔

آپ نے جو نکات اٹھائے ہیں وہ ایک سوچنے والے شخص کے ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں، تاہم معاملے کو اگر درست جگہ سے دیکھا جائے تو اصل حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ آپ جس جگہ سے اس معاملے کو دیکھ رہے ہیں وہ موجودہ دنیا اور اس کے قوانین کے اندر رہ کر اس معاملے کو سمجھنا ہے۔ اس فریم آف ریفرینس میں رہ کر مذکورہ بالا اعتراضات بالکل پیدا ہوتے ہیں۔ تاہم اللہ تعالیٰ جس پس منظر میں کلام فرماتے ہیں وہ آخرت کا پس منظر ہے۔ اسے اگر آپ سمجھ لیں گے تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ کیوں قرآن مجید شرک کے معاملے میں اتنا حساس ہے۔

دیکھیے ہماری موجودہ دنیا میں شرک کرنا یا نہیں کرنا ایک اخلاقی معاملہ ہے۔ تاہم آنے والی آخرت کی دنیا میں یہ کوئی اخلاقی معاملہ نہیں رہے گا بلکہ دیگر تمام اخلاقی معاملات کی طرح اس کی

مادی سزا و جزا برپا کی جائے گی۔ موجودہ دنیا کے ہمارے اخلاقی رویے اُس دنیا میں اپنے خیر کی بہترین جزا اور شر کی بدترین سزا پائیں گے۔ شرک کو ایک لمحے کے لیے چھوڑ دیجیے اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک یا بدسلوکی کا معاملہ لے لیجیے۔ ہم اپنے ماں باپ کے ساتھ اگر حسن سلوک کریں گے تو خدائی ضابطے کے مطابق ہم قیامت کے دن جزا کے مستحق ہوں گے۔ جبکہ ان سے بدسلوکی کا بدلہ عذاب ہے۔ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کیوں کرنا چاہیے، ان کے کیا احسانات ہوتے ہیں، وہ کتنے اعلیٰ ظرف اور ضرورت مند ہیں یا نہیں، اس سب سے قطع نظر جس آزمائش میں ہم کھڑے ہیں اس میں اس عمل کی سزا و جزا نکلنی ناگزیر ہے۔

ایسے میں اگر والدین اولاد کو حسن سلوک پر توجہ دلائیں تو اس کا ایک پہلو یہ ہوسکتا ہے کہ ان کو اس کی کتنی ضرورت ہے یا نہیں یا انہیں اخلاقی طور پر اس مطالبے کا کتنا حق ہے یا نہیں، مگر دوسری ناقابل تردید حقیقت یہ ہے کہ اولاد اگر بدسلوکی کرے گی تو اس کا لازمی نتیجہ جہنم کی آگ کی شکل میں نکلے گا۔ چنانچہ ایک شفیق باپ اپنی اولاد کو اگر اس معاملے میں توجہ دلاتا ہے اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ اپنے نتائج کے اعتبار سے یہ انتہائی سنگین معاملہ ہے۔

یہی وہ دوسرا پہلو ہے جس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ بار بار شرک سے لوگوں کو روکتے ہیں۔ یعنی یہ ان کی ضرورت نہیں بلکہ شفقت ہے جس کی بنا پر وہ لوگوں کو شرک سے روکتے ہیں۔ کیونکہ انسان اس دنیا میں جس آزمائش میں ہے اس میں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہی معاہدہ کرکے آیا ہے کہ وہ تمام اخلاقی مطالبات پر اپنی مرضی واختیار و ارادے سے عمل کرے گا۔ چاہے ان اخلاقی معاملات کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہو یا اس کے بندوں سے۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور تنہا اس کی بندگی چونکہ سب سے بڑا اخلاقی خیر ہے، اس لیے اس کی خلاف ورزی کی سزا بھی بہت بڑی ہے۔ اب ظاہر ہے دوسرے اخلاقی رویوں کی طرف بھی اللہ تعالیٰ ہی نے توجہ دلائی ہے اور تنہا ایک معبود کی

پرستش کی طرف توجہ دلانا بھی ان ہی کا کام ہے۔ گویا پچھلی مثال سے یہ یوں سمجھیں کہ باپ کے سوا کوئی توجہ دلانے والا اگر ہے ہی نہیں تو باپ دوسری اچھی باتیں بھی بتاتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہیے۔ یعنی اصل بات یوں نہیں کہ اپنے معاملے کو خود اٹھایا جا رہا ہے بلکہ ایک خیر پر توجہ دلانے والا چونکہ کوئی دوسرا ہے ہی نہیں تو بہر حال اسی کو توجہ دلانی ہو گی جس کا یہ کام ہے۔ چاہے اس معاملے کا تعلق اس کی اپنی ذات ہی سے کیوں نہ ہو۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ کسی شرم کی وجہ سے یا اپنا معاملہ سمجھ کر باپ کو ہرگز نہیں رکنا چاہیے کیونکہ وہ ایسا کرے گا تو بچہ مارا جائے گا۔ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کا ہے کہ وہ اپنی بے نیازی کی وجہ سے اگر شرک کی مذمت سے رک جائیں گے تو چونکہ ان کے سوا ہدایت دینے والا اور درست بات بتانے والا کوئی نہیں اس لیے ایسی صورت میں مخلوق تو ماری جائے گی۔ اس لیے وہ اپنے لیے نہیں بلکہ اپنی مخلوق کو بچانے کے لیے شرک کی برائی بیان کرتے ہیں۔

میرے بھائی اس پہلو سے آپ دیکھیں گے تو آپ کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کئی گنا بڑھ جائے گی کہ اس جیسی اعلیٰ ہستی جسے کسی کی بندگی اور عبادت کی ضرورت ہی نہیں وہ ہمیں بچانے کے لیے ہمارے جیسے گھٹیا لوگوں کے یہ الزام بھی سہہ رہا ہے کہ خدا کیسی ہستی ہے کہ احسان کر کے بدلہ چاہتا ہے۔ اللہ اکبر۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جس ہستی کے احسانات میں ہمارا رواں رواں دبا ہوا ہے، جس کے کرم کے بغیر ہم سانس نہیں لے سکتے، جس کی عنایت کے بغیر ہم پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے، جس کی توجہ کے بغیر بھوک ہمیں کچل ڈالے گی، دھوپ جھلسا دے گی، ٹھنڈ جما دے گی؛ اس ہستی کو کبھی یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کہ میرے ٹکڑوں پر پلنے والوں میرے سوا کسی اور کے احسان مند مت ہونا۔ تاہم یہ ہوا اور اتنے بڑے پیمانے پر ہوا کہ کروڑوں اربوں انسانوں پر مشتمل انسانیت گنتی کے چند لوگوں کے سوا ہمیشہ غیر اللہ کی محبت،

حمد، بندگی اور محبت میں جیتی رہی۔ انسانوں نے ہر دور میں سب سے بڑھ کر اسی اخلاقی مطالبے کو پامال کیا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کو اس معاملے میں بار بار شدت سے توجہ دلانی پڑی۔ یہی اس سوال کا جواب ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی بندگی پر اتنا زور کیوں ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ اسی اخلاقی مطالبے کی پامالی ہوئی ہے۔ آج اگر سب لوگ توحید پر پوری طرح قائم رہتے ہیں اور مثال کے طور پر ماں باپ کے حقوق میں بہت ڈنڈی مارتے ہیں تو آج کا ایک مصلح توحید پر گفتگو بہت کم کرے گا اور بار بار ماں باپ کے حقوق کی طرف توجہ دلائے گا۔

یہ دو پہلو اگر آپ پر واضح ہیں یعنی ایک یہ کہ لوگ سب سے زیادہ ڈنڈی توحید و شرک کے معاملے میں مارتے رہے ہیں اور دوسرے یہ کہ توحید و شرک دیگر اخلاقی مطالبات کی طرح آخرت میں ایک مادی جزا و سزا میں ناگزیر طور پر ڈھلے گا تو پھر آپ پر واضح ہو جائے گا کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے شرک سے بچنے پر اتنا اصرار کیا ہے۔

آخر میں اس بات کو بھی میں واضح کر دوں جو آپ نے اپنے ای میل میں اٹھائی ہے کہ کیوں اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں کریں گے۔ اس کی وجہ دراصل انسانوں کی اللہ تعالیٰ کے متعلق پھیلائی ہوئی یہ غلط فہمی ہے کہ ہم کچھ بھی کر لیں اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے۔ اس بات کو اگر سمجھنا ہے تو مسیحیت کی تاریخ پڑھیے کہ وہ ایک طرف اللہ تعالیٰ کی محبت کی غیر معمولی تصویر کھینچتے ہیں اور دوسری طرف پورے اطمینان سے اللہ کے رسول کو اس کا بیٹا بنا کر اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔ ''محبت '' کی ایسی شراب پی کر مدہوش ہو جانے والوں کو ہوش میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ اپنا قانون بتایا جائے اور ان کی غلط فہمی کی تردید کی جائے۔ یہ بہت بڑی گمراہی اور غلط فہمی کی تردید ہے اور بے خوفی کے بدترین رویے سے لوگوں کو ہوش میں لانے کی ایک حکیمانہ تدبیر ہے۔

امید ہے کہ بات واضح ہو گئی ہے۔

والسلام علیکم

ابو یحییٰ

سورۃ البقرہ (2)

سورہ بقرہ کی تمہید

ہم سورہ بقرہ کی ابتدائی پانچ آیات کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ان میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ سورہ فاتحہ میں جس ہدایت کی دعا کی گئی تھی سورہ بقرہ اسی ہدایت کے ساتھ نازل کی گئی ہے۔مگر اس ہدایت سے فائدہ وہی لوگ اٹھائیں گے جو خوف خدا کی نفسیات میں جیتے ہیں۔جو ایمان و اخلاق کے تقاضوں کو پورا کرتے اور ہر قسم کے تعصب سے خالی ہوکر آخرت کی جوابدہی کے یقین کے ساتھ حقائق پر غور کرتے ہیں۔یہی وہ لوگ ہیں جو اس ہدایت سے فائدہ اٹھا کر آخرت کی ابدی فلاح کے حقدار ہوں گے۔

یہ بات بھی واضح کی جا چکی ہے کہ اس سورت کی ابتدائی انتالیس آیات تمہید کی ہیں جن میں ہدایت کی تفصیل اور اس پر لوگوں کے ردعمل کا بیان ہے۔ان آیات کا ترجمہ درج ذیل ہے جس کے بعد ہم ان آیات میں زیر بحث آنے والے ان مضامین اور موضوعات میں سے ایک ایک کو لے کر ان پر بات کریں گے۔

> ”جن لوگوں نے (اس کتاب کو) نہ ماننے کا فیصلہ کر لیا ہے، ان کے لیے برابر ہے، تم انھیں خبردار کرو یا نہ کرو، وہ نہ مانیں گے۔ان کے دلوں اور کانوں پر (اب) اللہ نے (اپنے قانون کے مطابق) مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔اور (قیامت کے دن) ایک بڑا عذاب ہے جو ان کے لیے منتظر ہے۔
>
> اور انھی لوگوں میں وہ (منافقین) بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اللہ کو مانا ہے اور

قیامت کے دن کو مانا ہے، دراں حالیکہ وہ اصلاً ان میں سے کسی چیز کو بھی نھیں مانتے۔ وہ اللہ اوراہل ایمان، دونوں کوفریب دینا چاہتے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اپنے آپ ہی کو فریب دے رہے ہیں، لیکن اس کا شعور نھیں رکھتے۔ ان کے دلوں میں (حسد کی) بیماری تھی تو اللہ نے (اب) ان کی اس بیماری کو اور بڑھا دیا ہے، اور ان کے اس جرم کی پاداش میں کہ یہ جھوٹ بولتے رہے ہیں، ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (اپنے اس رویے سے) تم اس سرزمین میں فساد پیدا نہ کرو تو جواب میں کہتے ہیں کہ ہم ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار، یہی فسادی ہیں، لیکن اس کا احساس نھیں کررہے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی اسی طرح ایمان لاؤ، جس طرح (تمھارے سامنے) یہ لوگ ایمان لائے ہیں تو (بڑے تکبر سے) کہتے ہیں کہ ہم کیا ان احمقوں کی طرح ایمان لائیں؟ سن لو، یہی احمق ہیں، لیکن نھیں جانتے۔ اور جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے مان لیا اور جب علیحدگی میں اپنے شیطانوں کے پاس پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں، ہم تو مذاق کررہے تھے۔ اللہ ان سے مذاق کررہا ہے اور ان کی سرکشی میں ان کی رسی (اپنے قانون کے مطابق) دراز کیے جاتا ہے، اس طرح کہ یہ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ یہی ہیں جنھوں نے ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دی تو ان کا یہ سودا ان کے لیے کچھ بھی نفع بخش نہ ہوا اور نہ یہ کوئی راستہ پا سکے ہیں۔

ان کی مثال بالکل ایسی ہے، جیسے (اندھیری رات میں) کسی شخص نے الاؤ جلایا، پھر جب آگ نے اس کے ماحول کو روشن کر دیا تو (جن کے لیے آگ جلائی گئی تھی)، اللہ نے ان کی روشنی سلب کر لی اور انھیں اس طرح اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ وہ کچھ دیکھ نہیں سکتے؛ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، سو اب وہ کبھی نہ لوٹیں گے۔ یا بالکل ایسی ہے جیسے آسمان سے بارش ہو رہی ہے۔ اس میں اندھیری گھٹائیں بھی ہیں اور کڑک اور چمک بھی۔

وہ کڑک کے مارے اپنی موت کے ڈر سے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے لے رہے ہیں، دراں حالیکہ اس طرح کے منکروں کو اللہ ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ بجلی کی چمک ان کی آنکھیں خیرہ کیے دے رہی ہے؛ یہ اس میں کچھ چل لیتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کے کان اور آنکھیں بھی اگر اللہ چاہتا تو سلب کر لیتا۔ بے شک، اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (البقرہ 2:20-6)''

منکرین حق

آیت نمبر چھ تا سات میں حق کا انکار کرنے والا گروہ زیر بحث آیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہدایت کو ہدایت کی صورت میں دیکھ لینے کے باوجود بھی محض اپنے تعصّبات کی بنیاد پر اسے رد کر دینے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ ان کے قلوب و سماعت پر مہر لگا کر ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ دنیا میں گمراہی اور آخرت میں عذاب عظیم ہے۔

نفاق، حسد، فساد

ہدایت کے باب میں تیسرا گروہ منافقین کا ہے۔ یہ دراصل وہ یہودی تھے جو اتنے ایمان کے دعوے دار تو بن گئے جتنا ان کے تعصّبات گوارا کرنے کو تیار تھے یعنی اللہ اور آخرت پر ایمان، مگر اس سے آگے بڑھ کر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانا ان کو گوارا نہ تھا۔ یوں ادھورے ایمان کے مدعی بن کر وہ اللہ اور مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے تھے، مگر دراصل ان کا یہ عمل خود فریبی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

ان کے اس عمل کی وجہ حسد تھی۔ یعنی اس بات پر حسد کہ نئی نبوت یہودی قوم کے باہر کیوں آ گئی۔ چنانچہ اللہ نے اس حسد کو ہی دنیا میں ان کی سزا بنا دیا کہ اسلام کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان

کی حسد بڑھتی گئی اور انہیں جلاتی گئی اور آخرت میں ان کے لیے دردناک عذاب کا فیصلہ تھا۔

تاہم حسد ہمیشہ فساد پیدا کرتی ہے، چاہے وہ اصلاح کا جتنا چاہے لبادہ اوڑھ لے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اسی وقت متنبہ کردیا کہ جو کچھ تم کررہے ہو اس کا نتیجہ فساد کی شکل میں نکلے گا۔ مگر وہ اس حقیقت کا ادراک نہیں کرسکے اور یہ سمجھتے رہے کہ ہم مدعی ایمان بن کر دراصل مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات ٹھیک رکھنا چاہتے تھے اور یہ بڑا ہی اصلاحی عمل ہے۔

ان کا خیال تھا کہ سادہ دل مسلمان نئی نبوت پر ایمان لے آئے ہیں اور انہیں ان خطرات کا اندازہ نہیں جو اس ایمان کے نتیجے میں ظاہر ہوسکتے تھے۔ یہ اس بات کو حماقت سمجھتے ہوئے خود کو ان خطرات سے بچانے اور اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے سرگرم عمل تھے۔ چنانچہ وہ مسلمانوں سے ملتے تو اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ان کے سامنے ایمان کا اظہار کیا کرتے لیکن اپنے آپ کو خطرات سے بچانے کے لیے اپنی یہودی لیڈرشپ سے بھی روابط استوار رکھتے تھے۔ جب وہ شیطان صفت یہود سرداران کی سرزنش کرتے کہ تم مدعی ایمان کیوں بن رہے ہو تو وہ اپنی صفائی پیش کرکے کہتے کہ ہم تو آپ ہی کے ساتھ ہیں۔ مسلمانوں سے تو ہم دل لگی کررہے ہیں۔

جبکہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ تھا کہ ان لوگوں کو ڈھیل دے کر دراصل اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ مذاق کررہے ہیں۔ یہ اپنے اندھے پن میں بھٹکتے پھر رہے ہیں اور ہدایت سے محروم ہیں۔ یہ سزا ہے اس بات کی کہ انہوں نے ہدایت کے بدلے میں گمراہی کو خریدا اور نتیجتاً یہ ایک برا سودا ثابت ہوا۔

کفرونفاق کی تمثیل

آیت نمبر 17 سے ہدایت کا انکار کرنے والے دو گروہوں کی مثال دو اعلیٰ تمثیلوں کی شکل میں بیان ہورہی ہے۔ پہلی تمثیل کفار کی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اندھیروں میں گھرے تھے۔

ایسے میں ایک شخص نے روشنی کے لیے آگ جلائی تو عین اسی وقت ان کی بینائی سلب کر لی گئی ۔یوں اندھے اندھے ہی رہے۔ پہلے باہر کے اندھیرے کی بنا پر اور پھر اندر کی تاریکی کی وجہ سے۔ یہ اندھیرا اتنا بڑھا کہ اس نے ان کی سماعت اور گویائی کو بھی ختم کر ڈالا اور وہ ہمیشہ کے لیے ہدایت سے محروم ہو گئے۔

دوسری تمثیل منافقین کی ہے۔جن کا اصل کفار کی طرح تعصب کا اندھیرا نہیں تھا بلکہ ان کے مفادات انہیں بہت عزیز تھے جن کے لیے وہ کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے۔ چنانچہ ان کی تمثیل اس قافلے سے دی گئی جو اندھیری رات میں بارش میں گھر جائے۔ چمک ہوتی تو کچھ راہ نظر آتی اور وہ آگے بڑھنے لگتے۔مشکلات کا اندھیرا چھاتے ہی ان کی قدم رک جاتے۔کڑک ہوتی تو موت کے خوف سے وہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ۔یوں وہ رکتے چلتے اور ڈرتے بہرحال مسلمانوں کے قافلے کے ساتھ ہی چل رہے تھے۔ چنانچہ اللہ نے ابھی ان کی مہلت مکمل سلب نہیں کی اور پہلے گروہ کی طرح ان کو مکمل اندھا نہیں کیا بلکہ تنبیہات سے انہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

[جاری ہے]

مشکل میں اللہ کو یاد رکھنا مشکل نہیں
اصل مشکل آسانی میں اسے یاد رکھنا ہے

مبشر نذیر

ترکی کا سفر نامہ (2)

اہل اردن پاکستان سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ان کی جنگوں میں ہم نے ان کی مدد کی۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے تک اردن اور شام میں پاکستانیوں کی بہت عزت کی جاتی تھی۔ پچھلے سفر میں اردنیوں نے ہم سے بہت محبت کا سلوک کیا تھا۔ مگر محض دو سال میں صورت حال تبدیل ہو چکی تھی۔ ہم ان کے ملک کی سیاحت کا ویزا نہیں مانگ رہے تھے۔ مجھے صرف ٹرانزٹ ویزا درکار تھا جس کے تحت میں ان کے ملک سے محض گزرنا چاہتا تھا لیکن نہ تو وہ ویزا دینا چاہ رہے تھے اور نہ ہی صاف انکار کر رہے تھے۔

ترکی، شام اور اردن، پاکستان سے زیادہ ترقی یافتہ ممالک نہیں ہیں۔ خاص طور پر شام اور اردن کی فی کس آمدنی تو پاکستان کے آس پاس ہی ہے۔ یہ مشہور ہے کہ اپنے سے زیادہ امیر ملک کا ویزا حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ غریب ملک کا ویزا حاصل کرنا آسان ہوتا ہے۔ سری لنکا اور نیپال جیسے ممالک تو آمد پر ہی ویزا جاری کر دیتے ہیں۔ یہاں معاملہ الٹ ہو رہا تھا۔ میں سعودی عرب میں کام کرتا تھا۔ اپنی فیملی کے ساتھ اپنی گاڑی پر سفر کرنا چاہتا تھا اور اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ ان کے ملک میں جا کر غائب ہو جاتا۔ لیکن ان سب نے ویزا دینے میں محض اس وجہ سے پس و پیش کیا کہ میں اس ملک کا شہری تھا جس کے ساتھ کچھ ایسے مسائل ہیں جو دنیا میں کم ہی ملکوں کے ساتھ ہوں گے۔

یہ ایک اہم مسئلہ ہے جس کا تجزیہ کرنا اہل پاکستان کے لئے بہت ضروری ہے۔ ہم دنیا بھر میں اتنے بے وقعت کیوں ہو گئے ہیں کہ ہمارے برابر کے ممالک بھی ہمیں کوئی اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

ایک سطحی سوچ رکھنے والا تو یہی کرے گا کہ ان ممالک کو کوسنا شروع کر دے گا۔ ان کی حکومتوں کو برا بھلا کہے گا کیونکہ یہ ممالک پاکستان کے ساتھ تعصب رکھتے ہیں۔ ہم اسلام کا قلعہ اور واحد نیوکلیئر طاقت ہیں جس کی وجہ سے یہ ہم سے حسد کرتے ہیں۔

ایک اور سطحی تجزیہ " نظریہ سازش" کے نقطہ نظر سے کیا جا سکتا ہے۔ اس نظریے کے حاملین خود کو دنیا کا مرکز سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں پوری دنیا کو اس کے سوا اور کوئی کام نہیں ہے کہ وہ بس ان کے خلاف سازش کرتی رہے اور انہیں نقصان پہنچانے کی فکر میں لگی رہے۔ یہ ہر معاملے میں چند عالمی طاقتوں کی سازش دریافت کر لیتے ہیں۔ چنانچہ اس نقطہ نظر کے حاملین یہ کہہ سکتے ہیں کہ کچھ ملکوں نے پوری دنیا میں پاکستان کے خلاف لابنگ کی ہے۔ ان کی حکومتوں کو پاکستان کے خلاف کر دیا ہے جس کی وجہ سے یہ ہمیں ویزا دینے کو تیار نہیں ہیں۔ یاد رکھیے کہ دنیا میں کسی کے خلاف سازش تب ہی کامیاب ہوتی ہے جب اس شخص میں کوئی کمزوری موجود ہو۔

صحیح اور درست طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں کا تجزیہ کریں۔ ہم کسی کو بھی سازش کرنے سے نہیں روک سکتے مگر کم از کم اپنی خامیوں کو دور کر سکتے ہیں تا کہ ہر قسم کی سازش کو ناکام بنایا جا سکے۔

حقیقی وجہ یہ ہے کہ اخلاقی اعتبار سے ہمارا امپریشن پوری دنیا کے سامنے خراب ہو چکا ہے۔ عام زندگی میں ہم دوسروں کے ساتھ معاملات ان کی اخلاقی ساکھ (Credibility) کی بنیاد پر کیا کرتے ہیں۔ اگر ہمارا کوئی جاننے والا ایسا ہو کہ بات بات پر ناراض ہو کر لڑنے مرنے پر اترا رہے۔ معمولی سی تکلیف پر احتجاج شروع کر دے۔ قانون اور سماجی ضوابط کی پرواہ نہ کرے۔ ہمیں دھوکہ دے کر ہم سے ہمارا مال حاصل کرنے کی کوشش کرے اور پھر اپنی چالاکی اور دھوکے بازی پر فخر بھی کرے تو کیا ہم ایسے شخص سے رشتہ قائم کرنا پسند کریں گے؟ اس کے برعکس ہم ایسے شخص سے دوستی کرنا ضرور پسند کریں گے جو بڑی سے بڑی بات کو خندہ پیشانی سے برداشت

کرے۔ قانون اور سماجی ضوابط کی پابندی کرے۔ بات کا کھرا ہو اور کبھی کسی کو دھوکہ نہ دے۔

ہمارے ساتھ یہ المیہ ہو چکا ہے کہ پچھلے دو سو برس سے ہماری پوری قوم کو جعل سازی، دھوکہ دہی، منفی ذہنیت اور احتجاجی رویے کی تربیت دی جا رہی ہے۔ منشیات سے لے کر دہشت گردی اور جعلی دستاویزات تیار کرنے سے لے کر انسانوں کی اسمگلنگ جیسے جرائم کے منظّم نیٹ ورک ہم ہی نے بنائے ہیں۔ جن ترقی یافتہ اقوام نے ہمیں اپنے ممالک میں رہنے کی اجازت دی ہے، ہم وہاں بھی طرح طرح کے ہتھکنڈوں کے ذریعے کرپشن کو فروغ دے رہے ہیں۔ پچھلے چند برس میں ان تمام معاملات کو ہمارے معاشرے میں بہت فروغ حاصل ہوا ہے۔

اگرچہ ان معاملات میں ہماری قوم کے چند لوگ ہی ملوث ہیں لیکن کرپٹ ذہنیت ہمارے پورے معاشرے میں سرایت کر چکی ہے۔ آپ کو بارہا یہ تجربہ ہوا ہوگا کہ کوئی عام شخص آپ کو یہ کہے، "آپ اپنے ہیں اس لئے آپ کے ساتھ تو ایسا معاملہ نہیں کر سکتا۔" اس کا مطلب یہی ہے کہ غیروں کے ساتھ دھوکہ دہی کو وہ شخص جائز اور درست سمجھتا ہے۔ یہ ذہنیت چند افراد میں نہیں بلکہ پوری قوم میں سرایت کر چکی ہے۔ ان حالات میں اگر دوسرے ہم پر اعتماد نہیں کرتے تو ہمیں اس کا الزام انہیں دینے کی بجائے خود اپنے آپ کو دینا چاہیے اور اس کے حل کا آغاز اپنی ذات سے کرنا چاہیے۔

یہ درست ہے کہ ہمارے ہاں امیر و غریب کے فرق اور حکمرانوں کی لوٹ کھسوٹ نے کرپشن کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے مگر یہ ہمارے رویے کے لئے کوئی معقول بنیاد نہیں ہے۔ سری لنکا کی مثال کو لے لیجیے۔ یہ ہم سے زیادہ غریب ملک ہے مگر اخلاقی اعتبار سے ہم سے بہت بہتر ہے۔ ہمارے ہاں المیہ یہ ہے کہ ہم لوگ کردار سازی کا آغاز دوسروں سے کرنا چاہتے ہیں حالانکہ شخصیت و کردار کی تعمیر کا آغاز ہمیشہ اپنی ذات سے ہوا کرتا ہے۔ ہر

شخص دوسروں پر تنقید تو کرتا ہے مگر اپنی ذات کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دوسرے ٹھیک ہو جائیں تو معاملہ درست ہو جائے گا۔ معاملہ اس وقت تک درست نہیں ہو گا جب تک ہم خود ٹھیک نہ ہو جائیں۔

خیر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ الحمد للہ ہمارے ہاں اپنے کردار کی کمزوری کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ انسان ایسی مخلوق ہے کہ اس میں جب احساس پیدا ہو جائے تو پھر یہ مسئلے کا حل بھی نکال لیتا ہے۔

ہمیں اردن کا ویزا نہ ملنے کی تکلیف تو ہوئی مگر اس سے اپنے ان بھائیوں کی تکلیف یاد آ گئی جو مزدوری کی تلاش میں صبح گھر سے باہر آتے ہیں مگر انہیں کام نہیں ملتا۔ اپنے ایسے بھائیوں کی مدد ہمارا دینی فریضہ ہے۔ مگر ہم لوگ ایسے محنت کشوں کی مدد کی بجائے پروفیشنل بھکاریوں کو بھیک دینا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

اس ناکامی میں ہمارے لئے ایک اور بھی بڑا سبق تھا۔ آج تو محض اتنا ہی کہا گیا تھا کہ "تم اردن میں داخل نہیں ہو سکتے۔" اگر کل یہ کہہ دیا گیا کہ "تم جنت میں داخل نہیں ہو سکتے" تو پھر ہمارا کیا حال ہوگا۔ یہ تصور کر کے انسان کی روح لرز اٹھتی ہے۔

جان، مال اور آبرو خطرے میں

اردن کا ویزا نہ مل سکنے کے بعد ہم نے دوسرے متبادل طریقوں پر غور کیا۔ ایک متبادل راستہ یہ تھا کہ ہم عراق کے راستے شام میں داخل ہو جاتے۔ میں نے عراق کے سفارت خانے سے رجوع کیا تو انہوں نے پاسپورٹ دیکھنے کے بعد بخوشی ویزا دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ سعودی عرب کا عراق کے ساتھ زمینی رابطہ صرف ایک ہے۔ سعودی عرب کے شمالی شہر "عرعر" سے ایک سڑک عراق کے شہر "نخیب" میں داخل ہوتی ہے۔ یہ سڑک آگے چل کر کربلا اور بابل سے ہوتی ہوئی

بغداد پہنچتی ہے۔ یہاں سے ہم دریائے دجلہ کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے "سمارا" اور "تکریت" سے گزرتے ہوئے "موصل" جا پہنچتے جہاں سے محض ایک ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو پر ترکی کی سرحد تھی۔

دوسرا راستہ یہ تھا کہ ہم پورے عراق کو چھوڑتے ہوئے نخیب سے شام کی جانب مڑ جاتے اور "طولیاحہ" اور "ربطہ" سے ہوتے ہوئے تین چار گھنٹے میں شام میں داخل ہو جاتے۔

ان دنوں عراق کی جنگ ختم ہو چکی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ یہاں کا سفر محفوظ نہ تھا۔ کسی بھی مستحکم معاشرے میں انتشار پھیلا کر انارکی پیدا کرنا مشکل کام نہیں ہے لیکن اس کے بعد اس انتشار کو ختم کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انارکی کو ظالم سے ظالم حکومت سے بھی بدتر سمجھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ظالم حکومت کا ظلم چند افراد تک محدود ہوتا ہے مگر جب حکومت کی رٹ ختم ہو جائے تو پھر یہ ظلم ہر گھر تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد ہر وہ شخص جس کے پاس کچھ اسلحہ یا طاقت ہے، دوسرے کی جان، مال اور آبرو کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی وجہ سے حکمران کے ظلم پر صبر کرنے کی تلقین فرمائی ہے اور مسلح بغاوت کے ذریعے انتشار پھیلانے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں معاشرے کی جڑیں جب ہلتی ہیں تو پھر کسی بھی شخص کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہیں رہا کرتی۔ وہ ظلم جو چند افراد تک محدود ہوتا ہے، اس کی لپیٹ میں ہر بوڑھا، بچہ، خاتون اور معذور فرد آ جاتا ہے۔ آپ کا ارشاد گرامی ہے:

سیدنا سلمہ بن یزید رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا، "یا نبی اللہ! اگر ہم پر ایسے حکمران مسلط ہوں جو ہم سے تو اپنا حق طلب کریں مگر ہمیں ہمارا حق نہ دیں تو آپ کیا فرماتے ہیں؟" آپ نے ان کی بات کو نظر انداز کر دیا۔ انہوں نے پھر یہی سوال کیا تو آپ

نے پھر نظر انداز کر دیا۔ جب انہوں نے دوسری یا تیسری مرتبہ یہی سوال کیا تو اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ نے انہیں پکڑ کر کھینچا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "ان کی بات سنو اور ان کی اطاعت کرو۔ ان پر ان کے اعمال کی ذمہ داری ہے اور تم پر تمہارے اعمال کی۔" (مسلم، کتاب الامارت، حدیث نمبر 4782-83)

سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "میرے بعد ایسے حکمران ہوں گے جو میری راہ پر نہیں چلیں گے۔ میری سنت پر عمل نہیں کریں گے اور ان میں سے ایسے لوگ ہوں گے جن کے دل شیطان کے اور جسم انسان کے سے ہوں گے۔ " میں نے عرض کیا، "یا رسول اللہ! اس وقت میں کیا کروں؟" فرمایا، "اگر تم ایسے زمانے میں ہو تو حکمران کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ اگر چہ وہ تمہاری پیٹھ پر (کوڑوں کی) ضرب لگائے اور تم سے تمہارا مال بھی لے لے، تب بھی اس کی بات سنو اور اطاعت کرو۔" (مسلم، کتاب الامارت، حدیث نمبر 4785)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص حکومت کی اطاعت سے باہر ہو جائے اور جماعت (نظم اجتماعی) کا ساتھ چھوڑ دے اور مر جائے تو اس کی موت جاہلیت کی موت کی طرح ہو گی۔ اسی طرح جو شخص اندھے جھنڈے کے نیچے (کسی نامعلوم مقصد کے لئے) لڑے۔ اپنی قومی عصبیت کے لئے اس میں غصہ ہو، اپنی قومی عصبیت کی طرف لوگوں کو بلاتا ہو، اپنی قوم کی مدد کرتا ہو اور اس میں مارا جائے تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہو گی۔ جو شخص میری امت کے خلاف بغاوت کرے اور ان کے اچھوں اور بروں کو قتل کرے، اہل ایمان کو بھی نہ چھوڑے، اور جس سے معاہدہ ہوا ہو، اس کی بھی پرواہ نہ کرے تو نہ اس کا مجھ سے کوئی تعلق ہے اور نہ میرا اس سے کوئی تعلق ہے۔ (مسلم، کتاب

الامارت، حدیث نمبر 4786)

موجودہ دور کی تمام جنگیں اور بغاوتیں سو فیصد اسی معیار پر پوری اترتی ہیں جس کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے۔ یقینی طور پر عراق میں امریکی افواج غاصبانہ طور پر داخل ہوئی ہیں۔ ان کو اپنی سرزمین سے نکالنے کی جدوجہد عراقی عوام کا حق ہے۔ اگر کوئی بدمعاش ہمارے گھر میں آ گھسے تو کیا ہمیں اپنے گھر کو آگ لگا دینی چاہیے؟ اس کی بجائے ہمیں اپنے گھر کو ممکن حد تک بچاتے ہوئے غاصبوں کو باہر نکالنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ موجودہ دور میں اس کی مثال برصغیر پاک و ہند اور جنوبی افریقہ کی تحریک آزادی کی شکل میں موجود ہے۔

اہل عراق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان ارشادات کو بری طرح نظر انداز کیا اور امریکی افواج کو نکالنے کے لئے اپنا گھر جلانا شروع کر دیا اور اپنی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ اگر وہ اپنے حکمرانوں سے مطمئن نہ تھے تو انہیں بلٹ کی بجائے بیلٹ کی طاقت سے انہیں تبدیل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ اس کے برعکس انہوں نے اپنے پورے معاشرے کو تباہی کے راستے پر ڈال دیا۔ یہی وجہ ہے کہ عراق غیر ملکیوں کے سفر کے لئے تو کیا، خود ان کے اپنے لئے بھی محفوظ نہ رہا تھا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی مگر انارکی ابھی باقی تھی۔ دشمن افواج کو چھوڑ کر اہل عراق اب فرقہ وارانہ بنیادوں پر ایک دوسرے کے قتل میں مشغول تھے۔

جتنی ذہانت کسی کی بات کا جواب دینے کے لیے ضروری ہے
اس سے کہیں زیادہ ذہانت
اس کی بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے

ابو یحییٰ

برے رشتہ داروں سے قطع تعلق

سوال: جناب ابو یحییٰ صاحب!

السلام وعلیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

اگر آپ کے قریبی رشتہ داروں میں سے کوئی آپ کی عزت، جان اور مال پہ حملہ کرے تو اُن رشتہ داروں سے دینی اور اخلاقی لحاظ سے قطع تعلق کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اور اُن رشتہ داروں سے نفرت کرنا کیا فطری عمل ہے یا نہیں؟ اور اگر کچھ سا نجھے رشتہ دار صلح کرانا چاہیں تو اُنھیں کیسے انکار کیا جائے کہ اُن کی دل شکنی نہ ہو؟

والسلام

انصر محمود

جواب: السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

صلہ رحمی دین کے بنیادی احکام میں سے ایک حکم ہے۔ اس حکم کو بار بار اس لیے دہرایا گیا ہے کہ رشتہ داروں سے جب ملنا جلنا رہتا ہے تو بہر حال اختلافات ہو جاتے ہیں اور لوگوں کو ایک دوسرے سے شکایات ہو ہی جاتی ہیں۔ بعض اوقات لوگ ایک دوسرے کے ساتھ جانے انجانے میں زیادتی بھی کر دیتے ہیں۔ یہی وہ وجہ ہے کہ اس حکم کو دہرایا گیا ہے ورنہ رشتہ داروں سے محبت ایک فطری چیز ہے اس کا حکم دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ملتے رہنے سے چونکہ شکایات ہو جاتی ہیں اس لیے یہ حکم دیا گیا ہے۔

قرآن مجید بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہی پسند ہے کہ ہر طرح کے حالات میں صلہ رحمی

اوراحسان کا معاملہ کیا جائے۔اس کی ایک مثال واقعہ افک کی ہے جب سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر منافقین نے ایک تہمت لگائی۔جس سے متاثر ہوکر بعض مخلص مسلمان جن میں سے ایک مسطح بن اُثاثہ جو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے رشتہ دار تھے اس عمل میں شریک ہوگئے۔حضرت ابوبکر مسطح کے پورے گھرانے کی کفالت کرتے تھے مگر اس کے باوجود ان کی طرف سے جب یہ معاملہ ہوا تو سیدنا ابوبکر نے قسم کھالی کہ آئندہ ان کی مدد نہیں کریں گے۔اس پر اللہ تعالیٰ نے سیدہ کی برات ظاہر کرنے کے بعد اہل ایمان کو تلقین کی کہ ان لوگوں کو معاف کر دیا جائے (النور22:24)۔جس پر سیدنا ابوبکر نے نہ صرف انہیں معاف کیا بلکہ اور بھی زیادہ ان کی مدد کرنے لگے۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں کس حد تک جانا چاہیے۔تاہم اگر آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ کسی قریبی رشتہ دار کی طرف سے آپ کے خلاف سنگین نوعیت کا اقدام کیا گیا ہے اور یہ کسی وقتی تاثر یا غلط فہمی کا نتیجہ نہیں بلکہ آپ کی جان مال اور آبرو کو نشانہ بنانے کی شعوری کوشش ہے تو ایسی صورت میں ان لوگوں کے شر سے بچنے کے لیے ملنا جلنا ختم کیا جا سکتا ہے۔

رہی نفرت تو نفرت کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔نفرت میں مبتلا آدمی ہمیشہ منفی ذہن کا مالک ہوجاتا ہے اور اپنی دنیا اور آخرت کا نقصان کر دیتا ہے۔جہاں تک صلح کی کوشش کرانے والے رشتہ داروں کا سوال ہے تو اگر معاملہ اتنا ہی سنگین ہے تو ان کو بھی بتا دیا جائے۔امید ہے ان کی دل شکنی نہیں ہوگی۔

والسلام علیکم

غیب میں رہ کر یا غیب پر ایمان لانا

سوال: میرا سوال یہ ہے کہ مارچ کے شمارے میں سورہ بقرہ کی آیت 3 کا جو ترجمہ اور تشریح آپ نے ''مضامین قران'' کے قسط وار سلسلے میں آپ نے کیا ہے وہ روایتی ترجمے سے مختلف ہے یعنی جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔اس کی وضاحت کر دیجیے؟

ذیشان قریشی

جواب: السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

سورہ بقرہ کی آیت 3 میں بالغیب کے بارے میں اہل علم کی دو اراء ہیں۔ان کی تفصیل آپ ابن کثیر کی تفسیر کبیر اور زمخشری کی کشاف میں ملاحظہ کر سکتے ہیں تاہم خلاصہ یہ ہے کہ ایک رائے وہ ہے جس کے مطابق میں نے ترجمہ نقل کر کے تشریح کی ہے۔اس صورت میں ''ب'' ظرف کا سمجھا جائے گا ''بالغیب '' حال ہوگا اور ترجمہ یہ ہوگا کہ وہ غیب میں رہتے ہوئے ایمان لاتے ہیں۔جبکہ دوسری رائے جو اکثریت کی ہے وہ وہی ہے جو اپ نے بیان کی ہے اور جس کے مطابق ''ب'' بطور صلہ آیا ہے اور ''غیب'' اس میں مفعول ہے۔اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ وہ جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔لغت میں دونوں کی گنجائش ہے تاہم ہمارے نزدیک سیاق کلام اس بات سے ابا کرتا ہے کہ دوسرا مفہوم مراد لیا جائے۔

اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ صحابہ کرام کی یہ صفات یہود کے پس منظر میں بیان کی جا رہی ہیں۔ان کے متعلق اسی سورہ بقرہ اور دیگر سورتوں میں یہ تصریح آئی ہے کہ وہ غیبمیں رہتے ہوئے ایمان لانے کے لیے تیار نہیں تھے۔چنانچہ سورہ نساء (153:4) میں ان کا یہ قول نقل ہوا ہے:

يَسْئَلُكَ أَهْلُ الْكِتابِ أَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتابًا مِنَ السّماءِ فَقَدْ سَأَلُوا مُوسى أَكْبَرَ مِنْ ذلِكَ فَقالُوا أَرِنَا اللّهَ جَهْرَةً

''یہ اہل کتاب تم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ تم آسمان سے ان پر براہ راست ایک کتاب اتارلاؤ۔ یہ تو موسیٰ سے اس سے بھی بڑی چیز کا مطالبہ کر چکے ہیں کہ اللہ کو ہمیں علانیہ سامنے دکھاؤ۔''

یہ وہ مطالبہ ہے جو سورہ بقرہ (55:2) میں اس طرح بیان ہوا ہے:

وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَى لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّى نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً

یعنی اے موسیٰ ہم تمھاری بات کا ہرگز یقین نہیں کریں گے جب تک ہم خدا کو سامنے نہ دیکھ لیں۔ یہ پس منظر اگر ذہن میں رہے تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ صحابہ کرام کی کتنی بڑی خصوصیت تھی کہ وہ ایسے مطالبات کرنے کے بجائے غیب میں رہتے ہوئے ایمان لا رہے تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ''ایمان بالغیب'' سے یہاں اگر مراد یہی ہے کہ وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں تو پھر اگلی ایات میں جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے وہ غیب ہی تو ہے۔ پھر اس کے بیان کا کوئی محل باقی نہیں رہا۔ دیکھیے اگلی آیت میں کہا گیا ہے:

''جو ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو تم پر اتاری گئی ہے اور جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے۔ اور آخرت پر یہی لوگ یقین رکھتے ہیں۔''

سوال یہ ہے کہ حضرت جبریل نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے سینہ اطہر پر جب قران اتارتے تھے تو یہ ایک غیبی معاملہ تھا جیسا کہ سورہ شعرا آیت 193 میں ارشاد ہوا:

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلى قَلْبِكَ

اسی طرح سب سے بڑا اور تفصیلی غیبی عقیدہ اخرت اور احوال اخرت کا ہے جس میں قیامت، معاد، حشر، حساب، جنت وجہنم وغیرہ سب شامل ہیں۔ اگر یومنون بالغیب کے تحت یہ سب کچھ پہلے ہی بیان ہو چکا ہے تو ان چیزوں کو دوبارہ دہرانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

میں اس پس منظر میں ان اہل علم کی رائے کو ترجیح دیتا ہوں جو ''ب'' کو ظرف مان کر ترجمہ کرتے ہیں۔ اس کی مثال قران کریم میں اور بھی کئی جگہ ملتی ہے جہاں سب لوگ ''ب'' کو ظرف ہی لیتے ہیں۔ جیسے سورہ ملک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

إِنّ الّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبّهُم بِالْغَيْبِ لَهُم مّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ

یا پھر سورہ فاطر میں ہے

إِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالغَيْبِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ

ان دونوں اور کئی اور مقامات پر ''ب'' ظرف ہی کا سمجھا جاتا ہے اور سب لوگ ترجمہ ''غیب میں رہتے ہوئے ڈرنے'' کے الفاظ سے کرتے ہیں۔

امید ہے ہمارا نقطہ نظر واضح ہو گیا ہوگا۔

هذا ما عندى والعلم عند الله۔

ایمان کامل کی علامات

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من احب لله وابغض لله واعطى لله ومنع لله فقد استكمل الايمان۔ (بخاری، عن ابوامامہؓ)

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے اللہ کے لیے دوستی کی اور اللہ کے لیے دشمنی کی اور اللہ کے لیے دیا اور اللہ کے لیے روک رکھا، اس نے اپنے ایمان کو مکمل کیا۔

ابو یحییٰ

شہید کی حقیقت، انسان کی آمائش

میری کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کو اللہ تعالیٰ نے جو غیر معمولی قبولیت عطا فرمائی ہے وہ بلاشبہ اس کی مہربانی اور کرم فرمائی ہے۔ اس کتاب کے ذریعے سے آخرت کے بارے میں قرآن وحدیث کے بیانات کی ایک واضح اور روشن تشریح لوگوں کے سامنے گئی ہے اور الحمدللہ روز حشر پر لوگوں کا ایمان بہت پختہ ہوا ہے۔

تاہم اس ضمن میں لوگوں کے ذہن میں پیدا ہونے والے کچھ سوالات مجھ تک آتے ہیں اور میں ان کے جواب دیتا ہوں۔ ایسے ہی کچھ سوالات کے جواب میں میں آج افادہ عام کے لیے قارئین کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

شہید کون ہے؟

ایک سوال شہید کے تصور کے حوالے کیا گیا ہے۔ سوال کرنے والے دوست مبشر حنیف صاحب کے الفاظ میں یہ سوال کچھ اس طرح ہے۔

''ایک بات اگر آپ مناسب سمجھیں تو ذکر کیجیے گا کہ آپ نے ماشاء اللہ جنت میں جیسے صدیق، انبیاء وغیرہ کا انعامات کے حوالے سے جب زندگی شروع ہوگی میں کافی کرداروں کا تذکرہ کیا ہے لیکن شہداء کا ذکر نہیں ملتا جو فی سبیل اللہ قتال میں شہید ہوئے۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے یا محض اتفاق ہے یا ہوسکتا ہے کہ میں ہی مِس کر گیا ہوں۔''

اس حوالے سے میرا جواب درج ذیل ہے۔

لفظ شہید قرآن مجید میں تقریباً ساٹھ مقامات پر مختلف شکلوں میں آیا ہے۔ یہ لفظ ہر موقع پر اپنے لفظی مفہوم یعنی شاہد یا گواہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے سوائے ایک موقع کے جہاں یہ اطلاقی مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ قرآن مجید میں اصطلاحی طور پر اس

کا مطلب حق کی گواہی دینے والے لوگ ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں چونکہ قرآن مجید ایک اجنبی چیز ہے اس لیے لوگ سرے سے اس بات سے واقف ہی نہیں کہ لفظ شہید کی حقیقت کیا ہے۔ ورنہ یہی وہ منصب ہے جس پر صحابہ کرام کو فائز کیا گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر گواہ ہوں اور وہ لوگوں پر (الحج 78:22)۔ یہی وہ کام ہے جو روزمرہ زندگی میں تمام اہل ایمان کو کرنا ہے، (نساء 135:4)۔ یہی منصب ہے جو جنت کے چار کامیاب گروہوں میں سے تیسرا ہوگا یعنی انبیا صدیقین شہدا اور صالحین، (نساء 69:4)۔

ہمارے ہاں یہ لفظ جن معنوں میں معروف ہے یعنی مقتول فی سبیل اللہ وہ قرآن مجید میں ایک جگہ اطلاقی طور پر استعمال ہوا ہے یعنی سورہ آل عمران آیت 140 میں یہ بیان ہوا کہ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے جان دے کر بھی حق کی گواہی دی۔ یعنی اس لفظ کا اصل مطلب حق کی شہادت ہے اور جو لوگ یہ کام کرتے ہوئے اپنی جان بھی نچھاور کر دیں گویا کہ ان کے شہید (حق کے گواہ) ہونے میں اب کوئی شک اور گنجائش نہیں رہی۔ یہی وہ مفہوم ہے جو بعض احادیث میں بیان ہوا ہے اور جو ہمارے ہاں عوامی سطح پر زیادہ مشہور ہو چکا ہے۔ ورنہ دین پر تحقیقی نظر رکھنے والا ہر شخص یہ بات جانتا ہے کہ لفظ شہید کی اصل کیا ہے، قرآن کریم میں یہ کس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں کسی کو یہ غلط فہمی بھی نہیں ہونی چاہیے کہ احادیث میں یہ لفظ صرف مقتول فی سبیل اللہ کے لیے استعمال ہوا ہے بلکہ متعدد روایات میں یہ اپنے اصل مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسے روایت میں آتا ہے کہ انتم شهداء الله فی الارض، (صحیح الجامع رقم، 14906728,)۔ یعنی تم زمین پر اللہ کے گواہ ہو۔

میں نے اپنے ناول میں مرکزی کردار کو اسی حیثیت میں پیش کیا ہے۔ اس لیے یہ سمجھنا درست نہیں کہ اس میں کسی شہید یا اس کے مقام کا ذکر نہیں ہے۔ رہا یہ سوال کہ میں نے خاص طور پر کسی مقتول فی سبیل اللہ کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا تو یہ تاثر اس پہلو سے درست نہیں کہ میں ایک مقام پر ایسے لوگوں کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ وہ بھی بڑے اعلیٰ اجر کے حقدار ہوئے ہیں، (صفحہ 210)۔ اسی طرح دوسرے ناول ''قسم اس وقت کی'' میں میں سیدنا یاسر اور سیدہ سمیہ رضی

اللہ تعالیٰ عنہما کی شہادت اوران کی عظمت کا بیان ہے۔

ویسے بھی یہ شہداء (مقتول فی سبیل اللہ) دراصل ان شہدا کے ذیل میں ہی آ جاتے ہیں جو سورہ نساء میں بیان ہوئے ہیں۔آپ غور فرمایئے کہ میں نے تو قرآن مجید کے اس طریقے کو اختیار کیا ہے جس میں مقتول فی سبیل اللہ کو بھی شہید کے منصب پر فائز کیا گیا ہے۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ اس ناول کی تالیف کا اصل مقصد ہر ہر قسم کے نیکو کاروں کا تفصیلی بیان نہیں ہے۔کئی قسم کے اعلیٰ درجے کے جنتی ہیں جن کا میں نے ذکر نہیں کیا مثلاً اس میں نفلی روزے داروں کا ذکر نہیں جن کے لیے ایک حدیث کے مطابق جنت کا ایک خاص دروازہ یعنی ریان وقف ہے، بخاری رقم 1896 ۔اس کے علاوہ بھی روزے داروں کے غیر معمولی فضائل بیان ہوئے ہیں جیسے الصوم لی و انا اجزی به بخاری رقم 1894 مسلم 2707۔یعنی روزہ میرے لیے ہے اور اس کا بدلہ میں ہی عطا کروں گا۔اعتراض کرنے والا ذہن تو اس پر بھی اعتراض کرسکتا ہے کہ ایسی عظیم فضیلت کے باجود روزہ داروں کا خصوصی ذکر کیوں نہیں کیا گیا۔ لیکن ہر معقول آدمی سمجھ سکتا ہے کہ میرا لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ہر قسم کی نیکی کرنے والوں کا ایک کہانی میں احاطہ کیا جائے۔

میرا اصل مقصد حشر کی منظر کشی تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اہل جنت کی تمام اقسام کو گنوا دیا جائے اور ان کے تفصیلی معاملات بیان کیے جائیں۔اللہ کا شکر ہے کہ لوگوں نے اس اصل مقصد کو سمجھا اور ہزاروں لوگوں کی اللہ نے زندگیاں بدل دیں اور لاکھوں لوگوں تک اسلام کی بنیادی دعوت کا پیغام پہنچ گیا۔

نوعمر بچوں کا انجام اور انسان کی پہلی زندگی

ایک بہن میرے اس نقطہ نظر کا پس منظر جاننا چاہتی تھیں جو غلمان کے حوالے سے میں نے بیان کیا تھا۔اسی طرح میری اس رائے کی وجہ بھی جاننا چاہتی تھیں کہ انسان اس دنیا میں ہدایت کی جس سطح پر ہے، اس کا انتخاب اس نے خود کیا ہے۔میں نے دو ای میل میں ان کو جواب دیا ہے۔ پہلے میں ذرا اجمال تھا جو دوسرے میں کھول دیا گیا ہے۔ یہ دونوں ای میل قارئین کی

خدمت میں پیش ہیں۔

پہلا ای میل

تاخیر کے لیے معذرت لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ میں انتہائی مصروف تھا۔ آپ کے سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

1۔ پہلے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ اس مسئلے پر اہل علم کے مابین بہت اختلاف پایا جاتا ہے اور بالخصوص ان بچوں کے بارے میں جو منکرین کے ہاں پیدا ہوتے ہیں اور بچپن ہی میں انتقال کر جاتے ہیں۔ اس کی تفصیل کے لیے آپ مندرجہ ذیل لنک ملاحضہ فرمائیے

http://www.ruqya.net/forum/showthread.php?t=7043

میں نے اپنی رائے اُن اہل علم کے مطابق قائم کی ہے جو ان بچوں کے لیے جنت کے قائل ہیں۔ میں نے صرف اتنا کیا ہے کہ وہ جواز مہیا کیا ہے جس کی بنیاد پر یہ بچے جنت میں جائیں گے۔ اور یہ جواز سرتاسر مالک حقیقی کی رحمت، عدل اور اسکی حکمت کی صفات پر مبنی ہے۔ اگر آپ کے پاس قرآن وحدیث سے کوئی دلیل موجود ہے تو آپ مجھ سے اختلاف کر سکتے ہیں۔

2۔ قرآن سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ کل انسانیت نے مجموعی طور پر دنیا کی اس آزمائش کو خود قبول کیا تھا جیسا کہ سورہ احزاب میں بیان ہوتا ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے بہت واضح طور پر بیان کی ہے کہ انھوں نے انسان کو زبردستی اس امتحان میں مبتلا نہیں کیا ہے اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ اس کے نتائج کتنے تباہ کن ہو سکتے ہیں۔

اس طرح اس بات کو ماننا بھی ایک عقلی تقاضہ ہے کہ ہدایت کس کو کتنی ملنی ہے یہ بھی اللہ تعالیٰ زبردستی طے نہیں کرتے۔ ورنہ ابوجہل حشر کے دن یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ میرے ساتھ ناانصافی تھی کہ مجھے پیغمبر کے زمانے میں دنیا میں بھیجا گیا۔ اس لیے کہ پیغمبر کے انکار کی سزا سب سے بدتر ہے۔ اگر مجھے اُس زمانے میں نہ بھیجا جاتا تو کم از کم میری سزا تو کم ہوتی یا ہو سکتا ہے کہ میں اسلام ہی قبول کر لیتا۔ یہی بات جزا کے بارے میں بھی درست ہے۔ آج کے زمانے کا سب سے نیک انسان بھی حضرت ابوبکرؓ کی برابری نہیں کر سکتا۔ اس بات کو بھی کوئی نیک انسان چیلنج کر سکتا ہے

کہ اسے پیغمبر کے زمانے میں پیدا نہ کر کے اس کا اجر کم کر دیا گیا ہے۔

اس لیے میری عاجزانہ رائے اس بارے میں یہ ہے کہ ہر انسان کی ہدایت اور آزمائش کا درجہ بھی اُس کا خود کا چنا ہوا ہے۔ یہ بات قرآن سے اس طرح واضح ہوتی ہے کہ نہ صرف وہ یہ بیان کرتا ہے کہ انسان نے خود آگے بڑھ کر اس امانت کا بوجھ اٹھایا تھا بلکہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ ہر انسان اُس وقت انفرادی طور پر موجود تھا۔ اس لیے بظاہر کوئی وجہ اس بات میں مانع نہیں کہ ہر انسان کو یہ اختیار بھی دیا جاتا کہ وہ اپنی آزمائش کا درجہ بھی خود چن لے۔ یہی سبب ہے کہ جن لوگوں نے زیادہ اجر کی وجہ سے سخت آزمائش کا انتخاب کیا تو اُن کے لیے سزا بھی نتیجتاً سخت ترین ہے جیسا کہ رسولوں کے زمانے کے لوگ۔ یہ میرا نقطہ نظر ہے جو کہ میں نے قرآن کے ان نظائر کی بنیاد پر قائم کیا ہے لیکن اس سے اختلاف کا حق ہر ایک کو حاصل ہے۔

دوسرا ای میل

میرے اس جواب پر بہن نے اپنے نقطہ نظر پر اصرار کیا جس کے بعد میں نے اپنی بات کی کچھ اور وضاحت کی جو درج ذیل ہے۔

دیکھیے جو نقطہ نظر آپ بیان فرما رہی ہیں وہ اس شخص کے لیے تو یقیناً قابل قبول ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی حکمت اور عدل پر مکمل ایمان و یقین رکھتا ہو مگر جو شخص اعتراض کرنے کی جگہ پر آ جائے یہ جواب اسے بالکل مطمئن نہیں کر سکتا۔ اس بات کو مثال سے یوں سمجھیں کہ کسی برس مقابلے کے امتحان میں امیدواروں کے ایک گروپ کا امتحان لیتے وقت انہیں ایک ہی پرچہ دینے کے بجائے الگ الگ پرچے دیدیے جائیں اور ان میں سے بعض کے پرچے انتہائی سخت ہوں اور بعض نرم تو لازماً کہا جائے گا کہ یہ عدل نہیں ہوا۔ جب تک کہ اس عمل کی کوئی معقول وجہ بیان نہ کی جائے۔ اب اس عمل کی ایک ہی معقول اور قابل قبول وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ الگ الگ پوسٹ کے امیدوار تھے تبھی سب کو الگ الگ پرچہ دیا گیا۔

اب یہ سمجھیے کہ اس دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ کسی شخص کے اچھے برے حالات کو چھوڑ دیجیے کہ اس پر آخرت کی نجات منحصر نہیں اصل مسئلہ یہ سامنے آتا ہے کہ بعض لوگ ہدایت کے لحاظ سے ایسے

حالات میں پیدا ہوتے رہے ہیں کہ ایمان قبول کرنا انتہائی مشکل کام تھا۔ وہ ایمان قبول نہیں کریں گے تو آخرت میں لازماً مارے جائیں گے۔ مثال کے طور پر انبیا کے زمانے میں جو لوگ پیدا ہوتے ہیں بالعموم ان کا آبائی مذہب شرک ہوتا ہے جس سے انہیں گہرا تعصب ہوتا ہے۔ اب ایک طرف نبی اور رسول ہے جس کی بات نہ ماننے کا نتیجہ جہنم ہے اور دوسری طرف اپنا تعصب ہے جسے چھوڑنا انتہائی مشکل ہے۔ مزید یہ کہ ایمان لانے کی شکل میں زبردست آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے بلکہ جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ اندازہ کیجیے کہ یہ کتنا سخت امتحان ہے۔ اس کے برعکس میں اور آپ پیدائشی مسلمان ہیں۔ ایمان قبول کرنا ہمارے لیے سرے سے کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ قیامت کے دن کسی نبی کے انکار کرنے والے کے لیے اگر اس کے کفر کی بنیاد پر جہنم کا فیصلہ سنا دیا جائے تو وہ سوال کرے گا کہ آپ نے مجھے اتنا مشکل امتحان دیا ہی کیوں تھا۔ مجھے بھی کسی مسلمان کے گھر پیدا کر دیا ہوتا تاکہ میں اس سخت آزمائش میں پڑتا ہی نہیں۔ اب جواب میں اسے یہ بتایا جائے کہ اللہ کے علم و حکمت کا تقاضہ تھا کہ تمھیں اسی دور میں پیدا کیا جائے تو ظاہر ہے کہ یہ اس کے سوال کا جواب نہیں ہے۔ وہ صاف کہے گا کہ میرے ساتھ زیادتی کی گئی ہے اور مسلمانوں کے ساتھ نرمی کی گئی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی ہستی سے زیادہ عدل کرنے والا کوئی نہیں نہ اس کی کسی سے رشتے داری ہے۔

میری بہن یہ ہے وہ سوال جو برسہا برس سے لوگ مجھ سے کرتے رہے ہیں۔ اس کا کوئی معقول جواب ہمارے ہاں نہیں دیا جاتا۔ اس عاجز طالب علم کے سامنے اب ایک طرف اللہ تعالیٰ کی وہ صفات ہیں جن کے مطابق اللہ تعالیٰ بار بار کہتے ہیں کہ وہ نہ صرف عدل کرنے والے ہیں بلکہ کسی پر رائی کے دانے کے برابر ظلم کرنے والے نہیں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی ایک ملتے جلتے معاملے میں ہمیں ایک اصولی اطلاع دے دی ہے کہ انسانیت اس امتحان میں بالجبر نہیں بھیجی گئی بلکہ اپنی مرضی سے آئی ہے۔ ایک موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کے سامنے ارادہ و اختیار کی یہ امانت پیش کی تھی۔ تمام مخلوقات نے اس پیشکش کو رد کر دیا تھا مگر انسان نے اسے قبول کر لیا۔ چنانچہ سورہ احزاب کی آخری آیت میں لیعذب الله المنافقین ...... کے الفاظ

سے واضح کردیا گیا ہے کہ سزا جزا برپا ہونے کی وجہ ہی یہ ہے کہ انسان نے اپنی مرضی سے یہ سب قبول کیا ہے اور پھر اس کے تقاضے نہیں نبھائے۔

یہ مقام اگر انسانیت کے بارے میں مجموعی طور پر ایک بات بیان کرتا ہے تو یہ اشارہ بھی کرتا ہے کہ انفرادی طور پر بھی یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بالجبر افراد کو مختلف نوعیت کے امتحان میں ڈال دیا ہو بلکہ ان سے یقیناً ان کی مرضی لی گئی ہوگی۔ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ قرآن کے مطابق تمام اولاد آدم کو پہلے ایک دفعہ پیدا کیا جا چکا ہے۔

یہی وہ بات ہے جسے میں نے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ جس طرح انسانیت کو بالجبر دنیا میں دھکا دے کر نہیں بھیجا گیا اسی طرح افراد کا معاملہ ہوا ہوگا۔ بعض لوگوں نے جب انبیا کا ساتھ دینے کا اجر دیکھا تو وہ اتنا زیادہ تھا کہ وہ بے دریغ اس امتحان میں کود پڑے۔ یہ سوچے بغیر کہ نہ ماننے کی شکل میں عذاب بھی ایسا ہی ہوگا۔ اسی پر اللہ کا یہ تبصرہ ہے کہ انہ کان ظلوما جھولا ۔ یعنی اجر دیکھا مگر یہ نہیں دیکھا کہ عذاب کیسا ہوگا۔ مگر اب تم اس امتحان میں کود گئے ہو تو بہر حال میرا قانون تو حرکت میں آئے گا اور منافقین و مشرکین کو عذاب اور اہل ایمان کو اجر مل کر رہے گا۔ یہ ہے میرے نزدیک اس آیت کی درست تاویل اور یہ ہے اس اعتراض کا جواب۔ میرے نزدیک اس کو نہ مانا جائے تو اللہ تعالیٰ کے عدل پر زبردست سوالات پیدا ہو جائیں گے۔

تاہم میں پھر عرض کر دوں کہ یہ میرا نقطہ نظر ہے۔ آپ چاہیں تو اسے نہ مانیں لیکن پھر اس سوال کا کوئی معقول جواب آپ کو دینا ہوگا۔ صرف ایمان کے بیان سے کام نہیں چلے گا۔ اب وہ زمانہ نہیں کہ ایمان کی بات کر کے لوگوں کو خاموش کرا دیا جائے۔ اب ہمیں سوالوں کے معقول جواب دینا ہوں گے۔

والسلام علیکم

When Life Begins

English Translation of Abu Yahya Famous book

Jab ZindagiShuruHo Gee

A Book that created ripples through out the World

A Writing that was read by Millions

A Book that changed many Lives

A Writing that has become a Movement

A Comprehensive sketch of the World and Life in the Hereafter in the form of an interesting Novel

A Book that will strengthen your Faith in God and Hereafter

The first book of its kind in the world of Literature

For more information, please call:

(92) 3323 051 201

بس یہی دل

ابو یحیٰ کے قلم سے نکلے ہوئے وہ مضامین جو ایمان و اخلاق کی اسلامی دعوت کا بھرپور اور موثر بیان ہیں۔ دلنشین اسلوب میں لکھی گئی ایسی تحریریں جنھیں پڑھ کر آپ دل کے دروازے پر ایمان کی دستک سن سکھیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا مطلب

سنت اور پاکیزگئ دل

عن انس قال قال لی رسول صلی اللہ علیہ وسلم یانبی ان قدرت ان تصبح وتمسی ولیس فی قلبك غش لاحد فافعل ثم قال یانبی وذلك من سنتی ومن احب سنتی فقد احبنی كان معی فی الجنة۔ (مسلم)

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ مجھ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے میرے پیارے بیٹے! اگر تو اس طرح زندگی گزار سکے کہ تیرے دل میں کسی کی بدخواہی نہ ہو تو ایسی زندگی بسر کر۔ پھر فرمایا: یہی میرا طریقہ ہے (کہ میرے دل میں کسی کے لیے کھوٹ نہیں) اور جس نے میری سنت (طریقے) سے محبت کی تو بلاشبہ اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی، وہ جنت میں میرے ساتھ رہے گا۔

اطاعت رسولؐ کا صحیح طریقہ

جاء ثلاثة رهط الی ازواج النبی صلی الله علیه وسلم یسأ لون عن عبادة النبی صلی الله ولیه وسلم فلما اخبروبها كانهم تقالوها فقالوا این نحن من النبی صلی الله علیه وسلم وقد غفرالله ماتقدم من دنبه وماتاخر فقال احد هم اماانافاصلی اللیل ابداوقال الاخر انااصوم النهارابداو لاافطر وقال الاخر انا اعتزل نساء فلا اتزوج ابدا۔

فجآء النبی صلی الله علیه وسلم الیهم فقال انتم الذین قلتم كذا وكذا اما والله انی لاخشا كم الله واتقاكم له لكنی اصوم وافطر واصلی وارقد واتزوج النسآء فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔ (مسلم عن انسؓ)

تین آدمی، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے پاس آئے۔ جب انھیں بتایا گیا تو انھوں نے آپؐ کی عبادت کے مقابلے میں اپنی عبادت کی مقدار کو کم تصور کیا۔ کہنے لگے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارا کیا مقابلہ، ان سے نہ تو پہلے گناہ ہوئے نہ بعد مین ہوں گے (اور ہم معصوم نہیں ہیں۔ پس ہمیں زیادہ سے زیادہ عبادت کرنی چاہیے) چنانچہ ان میں سے ایک نے اپنے لیے یہ طے کیا کہ وہ ہمیشہ پوری رات نوافل میں گذارے گا، دوسرے نے کہا: میں ہمیشہ نفلی روزے رکھوں گا اور کبھی ناغہ نہ کروں گا۔ تیسرے صاحب نے کہا: عورتوں سے الگ تھلگ رہوں گا، کبھی شادی نہ کروں گا۔ (جب آپؐ کو اطلاع ملی) تو آپؐ ان کے پاس گئے اور فرمایا: کیا وہ تم ہی وہ لوگ ہو جنھوں نے ایسا ایسا کہا ہے؟ پھر آپؐ نے فرمایا: بلاشبہ مَیں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور اس کی نافرمانی سے بچنے والا ہوں۔ لیکن دیکھو! میں (نفلی) روزے کبھی رکھتا ہوں، کبھی نہیں رکھتا۔ اسی طرح میں (رات میں) نوافل بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور دیکھو! میں بیویاں بھی رکھتا ہوں (سو تمھارے لیے خیریت میرے طریقے کی پیروی میں ہے) جو شخص میری سنت سے بے رخی برتے یعنی جس کی نگاہ میں میری سنت کی وقعت نہیں، وہ میرے گروہ مین سے نہیں ہے۔

(ایک بندۂ خدا)